طبع اوّل تعداد ایک ہزار

قیمت عہ

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

ملنے کا پتہ

(۱) حیدرآباد ٹریڈنگ کمپنی ۳۲۲، چنچل گوڑہ ملک پیٹھ روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

(۲) سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد۔

(۳) مرکز مصنوعات ملکی (معاشی کمیٹی) محدود دوکان نمبر ۔ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن

(۴) سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

(۵) کتب خانہ۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

فہرست مندرجات

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	دیباچۂ مرتب	۵	۱۵	اعظم الامرا ارسطو جاہ	۶۳
۲	حکایاتِ رُومی	۱۷	۱۶	سَر سالار جنگ اعظم	۶۶
۳	پریم سوگ	۲۱	۱۷	نواب عماد الملک	۶۸
۴	سُریلے بول	۲۵	۱۸	نذر ولی	۷۱
۵	یُورپ میں دکنی مخطوطات	۳۱	۱۹	تاریخ ادب اُردو	۷۳
۶	معین سخن	۳۷	۲۰	مُرقّع سخن جلد اول	۷۵
۷	لآلیِ منشور	۴۱	۲۱	مرقّع سخن جلد دوم	۸۳
۸	الخیام	۴۳	۲۲	شعرائے عثمانیہ	۸۵
۹	نمودِ زندگی	۴۵	۲۳	سائنس کے کرشمے	۸۸
۱۰	مکتوباتِ شاد	۴۷	۲۴	آب دوز اور سُرنگ	۹۰
۱۱	مَن کی دنیا	۵۵	۲۵	فنِ تقریر	۹۲
۱۲	بازیچۂ دنیا	۵۷	۲۶	مصنوعی بیوی	۹۷
۱۳	گریہ و تبسم	۵۹	۲۷	دُنیائے افسانہ	۹۹
۱۴	محمد حسین آزاد	۶۱	۲۸	جیون چرتر	۱۰۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون
۲۹	متاعِ اقبال	۱۰۳	۳۶	داغ
۳۰	کلیاتِ بحری	۱۰۵	۳۷	فلسفۂ عجم
۳۱	راشد الخیری	۱۰۷	۳۸	مکتوباتِ امجد
۳۲	شیخ چاند	۱۱۰	۳۹	تمدنِ عتیق
۳۳	اِحسان دانش	۱۱۲	۴۰	بربطِ ناہید
۳۴	دُنیا کی کہانی	۱۱۶	۴۱	پریم رَس
۳۵	سیاحت نامہ	۱۱۸	۴۲	محبت کی چھاؤں

دِیباچہ

جامعہ عثمانیہ کے مایۂ ناز سپوت اور اُستاد ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری
ور (ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (لندن) ملک کے اُن افراد میں سے ہیں جنھوں نے
پنے کارناموں سے ہندوستان بھر میں نام پیدا کیا ہے۔ اُردو ادب کی جو خدمات
کٹر صاحب نے کی ہیں اور کر رہے ہیں وہ بہ ہر نوع ایسی ہیں کہ جب تک دُنیا
ں اُردو کا وجود رہے گا ڈاکٹر صاحب کا نام بھی باقی رہے گا۔ موصوف کی تصانیف
ں سے زیادہ ہیں۔ مقدمات، مضامین، مقالے، اور تبصرے وغیرہ ان کے
دہ ہیں۔ نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے مُصنفین و مؤلفین کی متعدد
تابوں کے ساتھ بھی ڈاکٹر صاحب کے مُقدمے شایع ہو چکے ہیں۔ اور اِس
رح اَب تک چھوٹے اور بڑے مقدمات کی ایک خاصی تعداد ہو گئی ہے جن میں
سے صرف چند مختصر مقدمے اِس مجموعے میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

مُقدمات اَدب کی جان ہیں۔ اُردو ادب پر کام کرتے کرتے اور تنقیدیں،
تبصرے اور مُقدمات لکھتے لکھتے ڈاکٹر صاحب کو اِس میں ایک ایسا مقام حاصل
ہو گیا ہے جو موصوف ہی کا حصہ ہے۔ موصوف کے لکھے ہوئے مُقدمات گوناگوں
خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں جن پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے لئے یقیناً ایک

ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ جن ناظرین نے مقدمات کا مطالعہ کیا ہے
میری رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہ پائیں گے۔ مقدمہ کی سب سے بڑی خو
یہی ہے کہ جو کچھ نقد و بحث ہو دیانتدارانہ ہو، مقدمہ میں صرف تعریف ہی تعریف ہو
اُسے مقدمہ نہیں قصیدہ کہنا چاہیئے۔ میں نے بعض اصحاب کے لکھے ایسے مقد
بھی پڑھے ہیں جنھیں صرف قصیدہ ہی کہا جا سکتا ہے میں نہیں سمجھتا کہ کتاب
پڑھ لینے کے بعد ایسے مقدمہ نگار کے متعلق ناظرین کیا رائے قائم کرتے ہوں گے

ڈاکٹر صاحب کے اکثر و بیشتر مقدمات کا میں نے اپنی بساط کے مطابق گہر
نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اَدب کو سمجھنے اور کتا
پر صحیح نقطۂ نظر سے مقدمہ لکھنے کا ایک خاص سلیقہ موصوف کو عطا کیا ہے۔ وہ جا
ہیں کہ کتاب کے کس حصہ پر زیادہ زور دیا جائے اور کونسا حصہ ناظرین کی را
کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ کہیں طائرانہ نظر ہے تو کہیں اِس محققانہ انداز سے
گہرافشانی کی گئی کہ خود صاحب کتاب کو بھی حیرت ہو۔ موقع بہ موقع مزید معلو
کے سامان بھی مہیا کر دئے جاتے ہیں۔ محاسن اور معائب دونوں پر روشنی
ڈالتے ہیں۔ کسی کتاب کے محاسن دِکھلانا بہت آسان کام ہے لیکن مصنف کو
رنج پہنچائے بغیر معائب پر روشنی ڈالنے اور خامیوں کی طرف متوجہ کرنے میں
بڑے بڑے اَدیب بھی بعض اوقات ٹھوکر کھا جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب
جہاں خوبیوں کو واضح کرتے ہیں کچھ ایسے خلوص سے معائب کی طرف بھی اشا
کر دیتے ہیں کہ اُس میں حوصلہ افزائی کا رنگ تنقیدی پہلو پر غالب آجاتا ہے
گویا کونین پر شکر چڑھا کر حلق سے اُتار دیتے ہیں کہ کھانے والے پر بار نہ گذر

مختصر تبصرے وغیرہ بھی شامل کئے گئے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی طویل تنقیدیں بھی جو جواہر سخن (مرتبۂ ہندستانی اکیڈیمی) جیسی کتابوں پر لکھی گئی تھیں شریک نہیں کی گئیں کیونکہ اس کتاب کا مقصد ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی و تنقیدی قوتوں کو پیش کرنا نہ تھا بلکہ ادبی ۔ اسی مناسبت سے اس مجموعہ کا نام "ادبی تاثرات" رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تبصرے بھی ایک خاص معیار کے ہوتے ہیں: دُنیائے افسانہ' کلام احسانِ دانش' متاعِ اقبال' راشد الخیری پر جو تبصرے ہیں اُن کے مطالعہ کے بعد ہی تبصرہ نگار کے پاکیزہ مذاق' وسعت نظر' اور بلند حوصلگی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

شیخ چاند مرحوم کی بے وقت موت پر ڈاکٹر صاحب کے جو تاثرات ہیں وہ مرحوم کی زندگی کا ایک ایسا خلاصہ ہیں جس کی نظیر نہیں مل سکتی اور اس کا لطف وہی اُٹھا سکتے ہیں جو مرحوم سے واقف ہوں۔

اس قدر لکھ دینے کے بعد شاید یہ ظاہر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ اس ادبی ذخیرے کو مرتب و شایع کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی۔ مجھے تو افسوس بھی ہے اور خوشی بھی۔ افسوس اس لئے کہ اب تک اس قسم کے بکھرے ہوئے جواہر پاروں کو کیوں ایک جگہ شایع نہیں کیا گیا اور کیوں ادبی دُنیا ان سے محروم رہی۔ اور خوش اس لئے ہوں کہ یہ سعادت میرے حصہ میں آئی۔

اس کی ترتیب و اشاعت سے متعلق مجھے ڈاکٹر زور صاحب سے ایک شکایت ہے کہ جب میں نے اپنے ارادہ کا اظہار (آج سے تقریباً ایک سال قبل) کیا تو موصوف نے اپنی عادتی حوصلہ افزائی کے خلاف مجھے مایوس کر دیا۔ مواد دینا تو

اس فہرست میں ڈاکٹر صاحب کے مقدموں، تنقیدوں، تقریظوں، ریڈیو کی اور دوسری تقریروں اور خاص رسالوں اور جلسوں کے لئے جو پیامات روانہ کئے گئے اور بعد کو اخبارات و رسائل میں شایع ہوئے اُن کے نام درج نہیں کئے گئے ہیں

۱۹۲۴ء

عنوان	رسالہ	مہینہ
ادبی تنقید	تحفہ	جولائی
طرز بیان	"	ستمبر
ادبی تنقید (قسط دوم)	"	اکتوبر
فرانسیسی ادبیات	"	نومبر
حب وطن	ارتقاء	نومبر، دسمبر
جامعہ عثمانیہ (نظم)	تحفہ	دسمبر

۱۹۲۵ء

عنوان	رسالہ	مہینہ
تم	ارتقا	جنوری
فرانسیسی ادبیات (قسط دوم)	تحفہ	"
حدیقۂ سنائی	"	فروری
تعصب	ارتقا	"
طبقات ناصری اور اس کا مصنف	تحفہ	مارچ
انگلستان اور ارتقائے تعلیم	ارتقا	اپریل
ہوریس اسمتھ کی شاعری	تحفہ	"
ابوالحسن تانا شاہ کی قبر پر	"	مئی
زندہ جاوید	"	ستمبر
روح تنقید	(کتاب)	

۱۹۲۶ء

عنوان	رسالہ	مہینہ
اردو کے اسالیب بیان	سہیل	اپریل
تازیانہ	نگار	مئی
میر انیس کی شاعری پر ایک نظر	نیرنگ خیال	جون
میر انیس کی شاعری پر ایک نظر دوسری قسط	الناظر	جون
تازیانہ (دوسری قسط)	نگار	"

سنہ ۱۹۲۸ء

سلطان محمود غزنوی اور علم و فضل } نگار جنوری

واجد علی شاہ کے خطوط اکلیل محل کے نام } نظام گزٹ اپریل

کتب خانہ جات شاہان اودھ اور دکنیات } تجلی اپریل

کرنل میکنزی کا مجموعہ ادبیات مشرقی } " مئی

دیوان یقین نگار جون

بہرام گور دکن میں مجلہ مکتبہ نومبر

شمالی اور دکنی اردو کی علحدگی } جامعہ ڈسمبر

سنہ ۱۹۲۹ء

گولکنڈے کا ایک قدیم ترین ادبی شہکار } مجلہ مکتبہ اپریل

دکنی کا اثر شمالی ہند پر اردو "

ابن نشاطی اور پھول بن معہ تصویر شاعر } مجلہ مکتبہ جولائی

دکنی مرثیے اڈنبرا میں اردو جولائی

اردو شہ پارے (کتاب)

اردو انشا پردازی سالنامہ رہبر دکن ڈسمبر

اورنگ زیب اور تانا شاہ "

شیطان مجلہ مکتبہ "

سنہ ۱۹۳۰ء

ہندستانی فونیٹیکس (کتاب انگریزی)

سنہ ۱۹۳۱ء

اخبار رنگین مجلہ عثمانیہ مارچ

گارساں دتاسی ہندستانی اپریل

افسانے مجلہ عثمانیہ جون

صوتیاتی تحقیقات مجلہ مکتبہ اکتوبر

اردو شاعری کا پہلا سرپرست شہزادہ } رہبر دکن ولی عہد نمبر

روح تنقید (تیسری طباعت)

سنہ ۱۹۳۲ء

حاتم کی مسلسل نظمیں مجلہ مکتبہ جنوری

ہندستانی کا آغاز مجلہ عثمانیہ جون

دہلی میں اردو شاعری کا آغاز ہندستانی جولائی

لسانیات — مجلہ مکتبہ — ستمبر

ہندستانی لسانیات (کتاب)

ہندستانی کا ارتقاء — ہندستانی — اکتوبر

تنقیدی مقالات (کتاب دوسرا ایڈیشن)

مثنوی قہوہ — مجلہ مکتبہ — نومبر

زبان اور سیاسیات — سالنامہ کاروان — ڈسمبر

اردو کے اسالیب بیان (کتاب دوسرا ایڈیشن)

۱۹۳۳ء

لے کونت دے خوب تنگ — ژورنل ایشیاٹیک (پیرس) — جولائی

میر حسن کی سحر البیان اور مرزا قتیل — مجلہ تحقیقات علمیہ — اکتوبر

چارکمان — حسن کار — اکتوبر

شہر حیدرآباد کا آغاز — ،، — نومبر

جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات — مجلہ عثمانیہ — ،،

ناموں کا ارتقاء — سالگرہ نمبر منشور — ،،

حیدرآباد کی آبادیاں — رہبر دکن سالنامہ

۱۹۳۴ء

سالنامہ سٹی کالج (ترتیب معہ اداریہ)

سٹی کالج کی تربیت — سالنامہ سٹی کالج — اپریل

جواہر سخن پر ایک نظر — مجلہ عثمانیہ — جون

سٹی کالج کے بعض قدیم طلبہ — سالنامہ سٹی کالج — جولائی

اردو مرثیوں کے ابتدائی گہوارے — مجلہ تحقیقات علمیہ — سالنامہ

حیدرآباد کی جدید اردو مطبوعات — مجلہ عثمانیہ — اگسٹ

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی (کتاب)

اردو کا قدیم ترین معیار سخن — نظام گزٹ — اکتوبر سالگرہ نمبر

اردو شاعروں کی بادشاہ پرستی — منشور — اکتوبر

قدیم اردو مناجاتیں — رہبر دکن — ،،

تذکرہ گلزار ابراہیم (ترتیب معہ مقدمہ)

حالی کی شخصیت ان کے کارناموں میں — مقالہ یوم حالی

۱۹۳۵ء

فن انشاء پردازی (کتاب)

دکن کی اردو شاعری (مقالہ ہندستانی اکیڈیمی)

فیض سخن	(کتاب معہ مقدمہ)	
استاد الاساتذہ حضرت فیض	رہبر دکن	سالگرہ نمبر
سنہ ۱۹۳۸ء		
اقبال کا اثر اردو شاعری پر	مجلہ عثمانیہ	جنوری
سب رس قطب شاہی	سب رس	״
حیدرآباد کا پہلا شاعر	رہبر دکن	سالگرہ نمبر
بیجاپور کا شاہی عاشور خانہ	سب رس	مارچ
اردو مرثیوں کا ارتقاء	״	״
استاد کل حضرت سید شمس الدین محمد فیض	ہندستانی	اپریل
حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی اردو خدمات۔	سب رس	اگسٹ
سرگذشت ادارۂ ادبیات اردو	״	ستمبر
خطبہ صدارت یوم اقبال	״	اکتوبر
(اسمعیل کالج جوگیشوری بمبئی)		
سنہ ۱۹۳۹ء		
گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت	سب رس	جنوری
روح غالب	(کتاب)	
عہد سلطان العلوم سے قبل کا آصفی ادب۔	مجلہ عثمانیہ	اپریل
سرگذشت غالب	(کتاب)	
علامہ سر ڈینی راس	سب رس	جنوری
گولکنڈے کے نئے قلعے میں ملا خیالی کی مسجد	״	اگسٹ
بھاگ متی یا حیدر محل	״	״
مکتوبات شاد عظیم آبادی (ترتیب)		
سنہ ۱۹۴۰ء		
شاہ سراج کا تکیہ اور عرس	سب رس	اپریل
سیر گولکنڈہ	(کتاب دوسرا ایڈیشن)	
آج کل کے اردو رسالے	سب رس	اگسٹ
تبصرے	״	״
عظمت اللہ خاں	״	ستمبر
اردو کے اسالیب بیان	(کتاب تیسرا ایڈیشن)	
حیات محمد قلی قطب شاہ	(کتاب)	
روح تنقید	(کتاب چوتھا ایڈیشن)	

حکایاتِ رُومی

(مقدمہ حکایات رومی مترجمۂ مولوی مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب مطبوعہ سنہ ۱۹۴۵ء)

مولانا جلال الدین رومی فارسی کے اُن شاعروں میں سے ہیں جن کے کلام کی وجہ سے خود فارسی زبان کا پایہ بلند ہوگیا۔ وہ نہ صرف ایک برگزیدہ شاعر تھے بلکہ عالی مرتبہ مفکر بھی۔ چنانچہ دنیا کے مفکرین میں اُن کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ یہ تو شاعری اور فلسفہ کا ذکر تھا۔ تصوف و عرفان کے لحاظ سے دیکھیے تو مولانائے رُوم کی ہستی اور بھی بلند مقام پر نظر آتی ہے۔ اُنکی "مثنوی" کے متعلق تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ ع

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

غرض جس معیار سے جانچیے جلال الدین رومی ایک خاص امتیاز کے مالک نظر آتے ہیں۔ وہ اُن چند ممتاز انسانوں میں سے ہیں جو گذشتہ ہزار ہا سال کے عرصے میں کبھی کبھی بطنِ گیتی سے نمودار ہوئے اور اپنے کارناموں کے ذریعہ سے زندگیٔ جاوداں حاصل کرلی۔ مولانائے روم کی مثنوی ایک گنجِ شائگاں ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔ یہ وہ "خم خانہ" ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا، حالانکہ اس میں صدیوں سے "حریفوں" کی "بادہ خواری" جاری ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ایک عجائب خانہ کی طرح یہ مثنوی ایسے ایسے عجائب و غرائب سے مالا مال ہے کہ ہر ذوق کا آدمی اس سے مستفید ہوتا ہے۔ کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ اب یہ اپنی اپنی ہمت ہے۔ مرغ کو دانہ ملتا ہے اور ہنس کو موتی۔ اقبال جیسے مفکر جب اس دریائے مواج میں شناوری کرتے ہیں تو

بے مدگی ہے اور اس قسم کی کوششوں کی قدر افزائی کی ضرورت ہے تاکہ اُردو ادب کا خزانہ دوسری زبانوں کے جواہر سے مالا مال ہو سکے اور پڑھنے والوں کے لئے طرح طرح کے مضامین کثرت سے مل سکیں۔ تنوع زندگی اور ترقی کے لئے ضروری ہے اور علم و ادب میں تو اُس کی وجہ سے بڑی شگفتگی اور پہنائی پیدا ہو جاتی ہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے نہ صرف مولانائے رُوم کے قصّوں ہی کو اُردو میں منتقل کیا بلکہ ایک اور مفید اور اہم خدمت انجام دی ہے، اور یہ وہ خدمت ہے جو مولوی رُومی کے بڑے بڑے معتقدوں اور بلند پایہ محققوں سے بھی نہ ہو سکی تھی یعنی اُن کے حالاتِ زندگی اور اُن کے مقبرے کے متعلق دلچسپ اور ضروری معلومات کی فراہمی۔ خاص کر موخر الذکر موضوع پر تو اُردو ہی کیا کسی اور زبان یہاں تک کہ فارسی یا عربی میں بھی معلومات شایع نہیں ہوئی ہیں۔ اِس لئے میں مرزا صاحب کو رائے دونگا کہ وہ اپنے مقدمہ کو علیحدہ کتابی صورت میں بھی شائع کریں۔

اِن نادر معلومات کے علاوہ مولانائے رُوم کی ایک قدیم تصویر کا عکس جو عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر نے بکمالِ نوازش مرحمت فرمایا ہے اور اُن کے مقبرے کی تصویر بھی اِس کتاب میں شریک ہے۔ یہ تصویریں تو پہلی دفعہ شایع ہو رہی ہیں، اور اُن کے مقبرے وغیرہ سے متعلق معلومات کے لئے اُردو دُنیا کو مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے پرنسپل ٹریننگ کالج کا مرہونِ منت ہونا چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ پُوری کتاب اُن ہی کی دلچسپی اور ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔ اُن کی مردم شناس نظروں نے مرزا عصمت اللہ بیگ جیسے جوہر کو پرکھ لیا، اور اُن کی ہمہ جہتی قابلیت سے ایسے مفید ادبی کام کرائے ہیں جو عنقریب ایک حد تک منصّۂ شہود پر آجائیں گے۔ مرزا صاحب کا مجموعۂ نظم "کاک ٹیل"

اُن کے جدّت پسندانہ ذوقِ سخن کا اچھا نمونہ ہے جو چھپ کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔
مرزا صاحب کی طبیعت میں ایک خاص جدّت اور جودت ہے جو کبھی اُنھیں نچلا نہیں بیٹھنے دے گی۔ وہ ہر وقت سرگرمِ کار رہتے ہیں، اور اُن کا دماغ معمولی معمولی چیزوں اور پامال حالات و خیالات میں سے بھی نُدرت اور شگفتگی کو ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ وہ اپنی تقریر اور تحریر دونوں میں ایسی پتے پتے کی باتیں بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مجھے یقین ہے کہ مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب کی یہ کتاب یوں تو ہر اُردو داں کی نظر میں وقعت حاصل کرے گی، لیکن جو اصحابِ ذوق، اُردو میں بچوں کے اَدب کی افسوس ناک کمی کو شدّت سے محسوس کر رہے ہیں وہ ضرور اس کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھیں گے۔

آئے دن کے معمولی واقعات ہی سمجھتے رہیں۔

پریم چند پہلے اُردو ادیب ہیں جنھوں نے اعلیٰ یا علمی طبقہ کو مخاطب کرنے کی جگہ عوام سے سروکار رکھا اور کیا تعجب ہے کہ اُن کا یہی کمال اُن کی قدر و منزلت میں رکاوٹ کا باعث ہوا ہو۔ جب اہلِ اُردو نے اُن کی خاطر خواہ قدر نہ کی تو وہ اہلِ ہندی کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر یہاں اُردو اور ہندی کا سوال نہ تھا بلکہ وہ اہلِ ہند کے خیالات اور عوام کے ذوق کا سوال تھا۔ افسوس ہے کہ اہلِ ہند خواہ وہ اُردو پڑھتے ہوں یا ہندی ابھی اتنے بیدار نہیں ہوئے ہیں جو پریم چند کی پوری طرح قدر کر سکتے۔ مگر وہ زمانہ آرہا ہے جب پریم چند کی حقیقی عظمت بے نقاب ہوگی اور اہلِ اُردو و اہلِ ہندی دونوں اپنے اس محسن کی تحریروں کو سرآنکھوں پر رکھیں گے۔

اگرچہ منشی پریم چند نے بظاہر ایک مایوس زندگی بسر کی اور وہ آخر تک کشمکشِ حیات میں مبتلا رہے۔ مگر اُن سے بڑھ کر کامیاب ادبی زندگی عہدِ حاضر کے کسی اور ادیب کو شاید ہی نصیب ہوئی ہے۔ وہ ایک ایسا ادب چھوڑ گئے جس کی نظیر نہیں۔ اُنھوں نے اپنی ساری عمر ہندستانی ادب اور ہندستانی زبان کی بے لوث خدمت میں گزار دی۔ تقریباً تیس سال وہ اِس کوشش میں منہمک رہے۔

اُن کی زندگی محبت، بخلوصِ عمل اور سادگی سے معمور تھی۔ اور اُن کی جملہ تحریروں میں بھی یہی خصوصیات نمایاں ہیں وہ تعصب سے پاک تھے۔

جس شخص میں محبت کا عنصر اِتنا زیادہ ہو کہ اپنا اصل نام چھوڑ کر پریم چند نام رکھ لے تو اُس کے دل میں کینہ اور حسد کے جذبات کیونکر راہ پا سکتے ہیں۔

راقم الحروف کو پہلی دفعہ ۱۹۳۱ئ میں منشی جی کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا

اور حسن اتفاق سے کئی روز تک مسلسل تفصیلی ملاقاتیں رہیں۔ اس کے بعد اُن سے مراسلت ہوتی رہی اور آخری دفعہ ۱۹۳۶ء میں پھر ہندستانی اکیڈمی کی سالانہ کانفرنس کے سلسلے ہی میں الٰہ آباد میں ملاقاتیں رہیں۔ اس زمانہ میں ہندی اُردو کا جھگڑا شروع ہو چکا تھا۔ اور منشی پریم چند ایک حد تک مایوس نظر آ رہے تھے۔

وہ بڑے آزاد خیال اور نڈر انسان تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے متعد و طرفداران ہندی کی موجودگی میں اہل ہندی کی زیادتی اور اُن کے ساتھ ذاتی اختلاف آرا کا قصہ بیان کیا۔ جس میں مضامین جاری رکھنے کی خواہش کی اور کہا کہ ہم تو آخر تک اتحاد و اتفاق پر قائم رہیں گے اور اُردو ہندی دونوں کو ملا کر ایک زبان ہندستانی بنانے کی کوشش کریں گے۔

اُن کا لباس بہت معمولی اور سادہ ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ کبھی انگریزی وضع کا سُوٹ پہنتے تھے اور کبھی شیروانی۔ چوڑی دار پاجامہ اور کشتی نما ٹوپی۔ ہندستانی اکیڈمی کی کانفرنسوں میں ہر روز نئی قسم کا لباس پہن کر آتے تھے۔ لیکن کسی وقت بھی اُن کے جسم پر قیمتی لباس نظر نہ آیا۔ وہ ایرانہ نمائش کے خیالی اور عملی دونوں طرح سے مخالف تھے۔

افسوس ہے کہ وہ اِس قدر جلد چل بسے۔ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک آدہ سال ہی میں ہم سے جُدا ہو جائیں گے۔ شاید یہ پریمی انسان اُردو اور ہندی کے بڑھتے ہوئے جھگڑوں کی تاب نہ لا سکا۔

محمد حسام الدین خاں صاحب غوری نے بڑا اچھا کیا کہ اُن کے حالات زندگی اور خصوصیاتِ تحریر کے متعلق یہ مختصر سی کتاب مرتب کر دی۔ یہ ایک تعارفی کوشش ہے

عظمت مرحوم کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ انگریزی اور اُردو ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے تھے کہ اِس موضوع سے متعلق ان کے مضامین اعلیٰ پایہ اور معیاری تنقید نگاری کے بہترین نمونے سمجھے جاسکتے ہیں۔

اسلوب تحریر کے علاوہ اُن کا طرز گفتگو بھی اِتنا دل کش تھا کہ اہل ذوق اُن کی صحبت سے کبھی سیر نہ ہونے پاتے تھے۔ دفتر ہو یا گھر، ہر جگہ صاحبانِ فضل وکمال اور طلبہ ان کو گھیرے رہتے تھے۔ وہ اگرچہ کسی کالج کے پروفیسر نہ تھے، لیکن کالجوں کے اکثر طلبہ اُن سے خانگی طور پر مستفید ہوتے رہتے تھے۔ اور وہ بھی لائق اور محنتی طالبعلموں کی بڑی قدر افزائی اور مدد کرتے رہتے تھے۔

حُسن اِتفاق سے مجھے بھی اُن کے شریفانہ کردار کے مطالعہ کا موقع ملا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اُن کے جیسے علم دوست بہت کم دیکھے ہیں۔ اعلیٰ قابلیت، ذاتی وجاہت، اور عہدہ دارانہ حیثیت کے ساتھ ساتھ دلی اخلاص اور سچی ہمدردی جتنی اُن میں نظر آئی کسی اور میں دکھائی نہ دی۔ اُن کی بڑی خوبی یہ تھی کہ دِلّی سے نکل کر اُنھوں نے حیدرآباد کو اپنا سچا وطن بنالیا تھا۔ وہ ان عہدہ داروں میں سے نہ تھے جو حیدرآباد صرف کمانے کے لئے آتے ہیں۔ اور اہلِ حیدرآباد کی طبعی مروت اور اِنتہائی سادگی سے بے جا فائدہ اُٹھانے کے باوجود اُن کو کسی کام کا اہل نہیں سمجھتے، اور اپنے دماغ سے اپنی برتری کا احساس کبھی دور نہیں ہونے دیتے۔

عظمت اللہ خاں مرحوم کی دردمند طبیعت ان کی اکثر نظموں میں بے نقاب نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے ہندستانی عورت کو جو مظلومیت کا مجسمہ اور مرد کی ستم رانیوں کا اکثر شکار رہتی ہے اپنی شاعری کا اہم ترین موضوع بنایا۔ اور اِس موضوع پر جو

ہی کے قلم سے نکل سکتی تھیں۔ اُن میں خیالات اور جذبات کے اظہار میں جو کاوش کی گئی ہے حد درجہ قابلِ داد ہے۔ انوکھی تشبیہوں کے استعمال میں تو اُن کو بڑا کمال حاصل تھا۔ اور ساتھ ہی لفظوں اور ترکیبوں کو وہ اس خوبی سے مصرعوں میں بٹھاتے تھے کہ اُن کی نظموں کا ہر بول سُریلا معلوم ہوتا ہے۔

اُن کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت اُس کا سُریلا پن ہے۔ وہ ہندی عروض سے بہت زیادہ متاثر تھے اور اُنھوں نے اِس نقطۂ نظر سے شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا شاعری کے عنوان سے اُن کا جو مضمون اِس مجموعہ میں شریک کیا جا رہا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ فنِ عروض میں اُنھوں نے ایک اجتہادی شان حاصل کر لی تھی۔ اِس موضوع سے متعلق اُن کے خیالات اور نتائج پر کسی اور موقع پر بحث کی جائے گی۔ اِس وقت صرف اس واقعہ کا اظہار کافی ہے کہ امیر خسرو کے بعد اگر کسی اُردو شاعر نے عروض میں غیر معمولی جدتیں پیدا کیں تو وہ عظمت ہی تھے۔ اُن کی بعض نظموں کی بحریں اور شکلیں اُردو کے لئے نئی ہیں۔ اُنھوں نے نئے نئے ترکیب بند اختیار کئے۔ اور اپنی شاعری کو مطالب و معانی اور ترتیب و اسلوب دونوں کے لحاظ سے اُردو ادب میں ایک بالکل نئی سوغات بنا کر پیش کیا۔

اُردو میں ہندی لفظوں اور بحروں کا استعمال عظمت ہی کی شاعری کی وجہ سے مقبول ہوا۔ اُن سے پہلے اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے بھی اس طرف کچھ توجہ کی تھی لیکن اُن کے کلام کے سوقیانہ حصے نے ان کی اِس خوبی کو نمایاں نہ ہونے دیا۔ لیکن عظمت نے اپنی پاکیزہ نظموں کے ذریعہ سے اِس خصوصیت کو اِس خوبی سے چمکایا کہ آج کئی اُردو شاعر مثلاً جوش، حفیظ، ساغر، اور حامد اللہ افسر وغیرہ اُنہی کے رنگ میں

لکھکر مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عظمت اللہ خاں نے ایک ایسی شاہراہ بنادی جس پر اب آسانی سے ہر شاعر گامزن ہو سکتا ہے۔

عظمت اللہ خاں کی نظمیں جب پہلی دفعہ منظر عام پر آنے لگیں تو نوجوانوں کے علاوہ بعض پختہ مشق شاعروں پر بھی اُنکا اثر پڑنے لگا چنانچہ سلیم اور جوش سب سے پہلے ان سے متاثر ہوئے اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہیں کہ سلیم نے جو آخر عمر میں پھر شاعری کی طرف توجہ کی اس کے اسباب میں سے ایک اہم وجہ عظمت اللہ خاں کی انہی ولولہ انگیز نظموں کی اشاعت تھی، جن کو پڑھ کر اس بوڑھے ادیب میں پھر سے جوانی کی ترنگیں موجزن ہو گئیں۔ حالانکہ سلیم نے سالہا سال سے شعر و سخن کا مشغلہ ترک کر دیا تھا۔

افسوس ہے کہ یہ رباب اس قدر جلد ٹوٹ گیا لیکن اس سے جو نغمے پیدا ہوئے وہ دیر تک باقی رہیں گے۔ اور نئے نئے نغموں کی تخلیق کا باعث ہوں گے۔

جیسے جیسے زمانہ گذرتا جائے گا عظمت مرحوم کی شاعری کی صحیح عظمت بے نقاب ہوتی جائیگی۔ اور خاص کر عہد حاضر میں اردو اور ہندی کو ملا کر ایک ہندستانی زبان بنانے کی جو کوششیں کیجا رہی ہیں، وہ اگر کامیاب ہوگئیں تو عظمت کا کلام اس "ہندستانی" کا قدیم ترین نمونہ سمجھا جائیگا، اور وہ اس قومی زبان کے اولین شاعر مانے جائینگے۔ یوں تو اب بھی اُنکے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اسکو اردو رسم الخط میں لکھا جائے تو اردو ہے، اور اگر ناگری میں لکھا جائے تو ہندی۔ کیا تعجب ہے کہ ہندی ساہتیہ سمیلن جو آج قدیم دکنی شاعروں کے کلام کو ہندی رسم الخط میں چھاپ کر اپنے ادبی خزانہ میں اضافہ کر رہی ہے، کل عظمت مرحوم کے کلام کو بھی چھپوائے اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ کلام ناگری رسم الخط میں منتقل ہونے کے بعد خود ہندی شاعری کو بھی مالامال کر دے گا۔

سالہ شاید ہی بچا ہو۔ کسی میں کوئی قدیم نامعلوم شاعر رُوشناس کرایا گیا ہے
کتاب کا ذکر ہے۔ اور پھر ایک دو نہیں متعدد فاضل اہل قلم قدیم اُردو ادب
کی تحقیق و تلاش اور بحث و مباحثہ میں مصروف ہیں۔ کوئی اپنے گھر بیٹھے کتابیں جمع کرنے اور
اُن پر مقالے لکھنے میں مشغول ہے تو کوئی اِس مقصد کی خاطر دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے
کہیں اُن کو مرتب و مدون کر کے شایع کرنے کی فکر کی جا رہی ہے تو کوئی اُن کے متعلق
مقالہ لکھ کر جامعوں سے ڈگری حاصل کر رہا ہے۔ غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے سونے
کی کانوں کی طرح کوئی معدن مِل گیا ہے، جس کی طرف ہر نئے پرانے کی نظر لگی ہوئی ہے۔

اِن باہمت نظر بازوں میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ایک مخصوص حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی پہلی کتاب "دکن میں اُردو" ہماری زبان کی اِبتدائی کتابوں اور مصنفوں کا غالباً پہلا تذکرہ ہے۔ دکنی ادب پر غور و خوض اور اُن کو عام اُردو دانوں میں رُوشناس کرنے کا ہاشمی صاحب کو اس درجہ شغف ہے کہ اگر وہ دفتر دیوانی فینانس میں ملازم نہ ہوتے تو میں سمجھتا کہ اُن کا پیشہ یہی ہے۔

یہی غیر معمولی اِنہماک تھا کہ اُنہوں نے یورپ جانے اور دکنی مخطوطوں پر کام کرنے کا موقع پیدا کر ہی لیا۔ ورنہ اُن کی ملازمت کی نوعیت اور اِس قسم کے کام کرنے کے اُمیدواروں کی کثرت کے مقابلہ میں بہت کم توقع تھی کہ حکومت اُنہیں یورپ روانہ کرتی!

ہاشمی صاحب سرزمین دکن کے اُن نوجوانوں میں سے ہیں جو خاموشی کے ساتھ ہمیشہ سرگرم کار رہتے ہیں جب یہ حیدرآباد کے مایۂ ناز دارالعلوم کالج کے طالب علم تھے اُسی وقت سے اُن کا علمی و ادبی ذوق اُنہیں ہم چشموں میں ممتاز بنا رہا تھا۔ اپنے کالج کی انجمن "ثمرۃ الادب" کے معتمد تھے۔ اور اُسی زمانہ سے اپنے خاندان کے قابل

تقلید بزرگوں کی طرح تاریخ دکن سے خاص انہماک رکھتے تھے۔ اس موضوع پر بھی اُن کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی کتاب ”دکن میں اُردو“ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اس کی کماحقہ قدردانی کی گئی۔ اور ملک کے مشہور علم دوست اور فاضل نواب سر امین جنگ بہادر نے اس کے متعلق جو رائے ظاہر فرمائی ہے وہ نوجوان مصنف کی خاص ہمت افزائی کا باعث ہوئی اور کوئی تعجب نہیں اگر اسی حوصلہ افزائی نے ہاشمی صاحب کو سعیِ پیہم کی طرف مائل کیا ہو۔

اُن کی اس کتاب ”یورپ میں دکھنی مخطوطات“ کا موضوع کئی وجوہ سے اہم ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں جن کتابوں اور مصنفوں کی نسبت معلومات پیش کی گئی ہیں وہ اُردو زبان کے قدیم ترین کارنامے اور اساتذہ ہیں۔ اور یہ کارنامے اور اساتذہ اس لئے قابل وقعت ہیں کہ اُن کے سوا آج سے دو سو برس پہلے کے اُردو لکھنے والوں یا اُردو کتابوں کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دکن کے علاوہ گجرات کا بھی قدیم کلام دستیاب ہوا ہے، مگر ایک تو وہ قلیل ہے اور دوسرے اس میں ادبی اور شعری عنصر کا ناقابل فروگذاشت فقدان ہے۔

دکن اور گجرات کے ابتدائی شہ کاروں کو نکال ڈالئے تو پھر تاریخ ادب اُردو میں شہنشاہ اورنگ زیب سے پہلے کے زمانہ کے لئے صفحات کے صفحات خالی چھوڑ دینے پڑیں گے۔ شمالی ہند اور خاص کر دوآبہ گنگ وجمن جو ہمیشہ تہذیب وتمدن اور علم وفن کا سرچشمہ رہا ہے اُردو کے لئے صدیوں تک بنجر ثابت ہوتا رہا۔ اس کے اسباب نہایت دلچسپ اور اہم ہیں میں نے اپنی مطبوعہ انگریزی کتاب ”ہندوستانی صوتیات“ میں اس پر کچھ بحث کی ہے، اور اس کے علاوہ ہندوستانی اکیڈمی کی تیسری سالانہ کانفرنس میں

اِس موضوع پر ایک تفصیلی پرچہ پڑھا ہے جو اکیڈیمی ہی کی جانب سے شائع ہو رہا ہے۔

یہاں صرف اِس اَمر کی طرف اِشارہ کرنا کافی ہے کہ شمال مغربی سرحد سے جو مسلمان ہندستان میں داخل ہوئے وہ پہلے پہل پنجاب میں آکر ٹھیرے۔ وہاں کے باشندوں کے میل جول سے جو نئی مشترکہ زبان پیدا ہوتی رہی اُسی کو لیکر وہ دوآبہ گنگ وجمن میں اُترے اور اُسی کو بولتے ہوئے دکن میں بھی داخل ہوئے۔

دوآبہ میں مسلمان فاتحوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی تھی اور اُس دوآبہ کی خاص زبان برج بھاشا کا زیادہ اثر اُس پر نہیں پڑ سکا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کی طرف رُخ کیا اور اُن کا ایک بڑا ایلاب جو صلہ مند محمد تغلق کے ساتھ دہلی سے اُٹھا اور دکن میں جاکر رُک گیا۔ یہ فاتحین اپنے ساتھ جو زبان دکن میں لیتے آئے تھے وہ یہاں آزاد نشو ونما حاصل کرنے لگی اور چونکہ برج بھاشا کے علاقہ سے دور جا پڑی تھی اِس لئے اُس میں برج کا صرف وہی اثر باقی رہا جو برج کے علاقہ سے نکلنے سے پہلے اُس پر مستولی ہو چکا تھا۔

جو مسلمان دوآبہ ہی میں رہ گئے اُن کی خام ہندوی (جو شرقی پنجابی اور ہند ایرانی عناصر سے مرکب تھی) رفتہ رفتہ برج سے متاثر ہوتی گئی اور آخرکار اِس رنگ میں اِتنی رنگی گئی کہ دو تین صدیوں ہی میں بول چال کے لئے برج بھاشا کی جانشین بن گئی۔

دکن کی زبان کی شمالی اُردو سے علیحدگی کے اسباب لسانی اور سیاسی دونوں قسم کے ہیں۔ اور یہ سب کتاب "ہندستانی صوتیات" میں مندرج ہیں یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ رہا یہ سوال کہ ہندستانی کی اِس آزاد شاخ میں آج سے دوسو برس

پہلے ادب کیوں لکھا گیا اور شمالی اُردو میں کیوں نہیں لکھا گیا اس کا جواب ہمارے اس پرچہ میں ملے گا جو ہندستانی اکیڈیمی میں پڑھا گیا تھا۔ دکن میں اُردو سرپرستی اور اردو ادب کی تاریخ میں نے "اُردو شہ پارے" میں منضبط کر دی ہے۔ اور جا بجا اُن مخطوطوں کے متعلق حوالے اور اشارے لکھ دیئے ہیں لیکن اُس میں کوئی تفصیلی معلومات درج نہیں یہ کام میرے موضوع سے باہر تھا۔ مگر اُس پر کام کرنے کی سخت ضرورت تھی تاکہ اُردو زبان پر تحقیق و تفتیش کرنے والے اپنے قدیم ادیبوں کے مسودوں اور مخطوطوں سے واقف ہو سکیں۔ اِس کام کی اہمیت پر زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ اُردو ہمیشہ شکرگزار رہے گی کہ نصیر الدین ہاشمی صاحب کے صحیح ذوق ادب نے اس کی تکمیل کر دی ہے چونکہ اس کام کی ضرورت اور خوبی سے میں پہلے ہی واقف ہو چکا تھا اور اس کی ترتیب و تشکیل میں آغاز کار ہی سے دلچسپی لیتا رہا ہوں اس لئے اس کی مدح سرائی کرنا مناسب نہیں سمجھتا مجھے یقین ہے کہ اس کے پڑھنے والے ایک سرسری نظر ہی میں اس کی اہمیت سے واقف ہو جائیں گے اور ہاشمی صاحب کی یہ کوشش اُردو زبان کے جدید تحقیقی و تنقیدی کارناموں میں ایک بے نظیر جگہ حاصل کرے گی۔

اِس ضخیم کتاب میں صرف یورپ کے مخطوطوں کا ذکر ہے۔ سرزمین دکن میں لکھی ہوئی وہ سیکڑوں بیش بہا کتابیں اس میں درج نہیں جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر انجمن ترقی اُردو، نواب سالار جنگ۔ آغا حیدر حسن اور حیدرآباد کے دوسرے امیروں اور عالموں کے کتب خانوں میں جو نایاب ذخیرے محفوظ ہیں اُنکے تذکرے بھی اسی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ شائع ہو جائیں۔ اور اُردو ادب کی تاریخ

کی تکمیل میں آسانی ہو۔

ہاشمی صاحب نے یورپ کے کتب خانوں میں جس دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا اور وہاں کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کیٹلاگوں کی غلطیوں کی اصلاح کی اُن کا تفصیلی ذکر ان خطوط سے معلوم ہوگا جو وہاں کے اربابِ اقتدار نے اُن کے نام لکھے ہیں اور جن میں سے بعض اِس کتاب میں انھوں نے شریک کئے ہیں میں اسی قدر کہوں گا کہ جو کچھ مطالعہ کیا اس کو نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ قلم بند کر لیا ہے۔ اور بعض ناواقف حضرات کے اِس خیال کو غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ اُردو زبان و تاریخ ادب کی تحقیق و تفتیش کے لئے یورپ جانا لا حاصل ہے۔

یہ تو صرف دکن کے کارناموں کا تذکرہ ہے۔ شمالی ہند کے اُردو ادب کے متعلق بھی یورپ کے کتب خانوں میں اہم اور کمیاب مواد موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب تک اِس سے مدد نہ لی جائے گی اُردو زبان و ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہ ہو سکے گی۔

مُعین سُخن

(مقدمہ مجموعۂ کلام نواب معین الدولہ بہادر مطبوعہ ۱۹۳۲ء)

نواب معین الدولہ بہادر معینؔ ایک ایسے اعلیٰ پایہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کا تعارف کرانا آفتاب کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ امرائے پائیگاہ اپنے فضل و کمال، شجاعت، سپہ گری، نیک خلقی و راستبازی، اور ملک و مالک کی بہی خواہی کی وجہ سے دکن کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ تیغ جنگ جیسے شجاعت مآب، فخرالدین خاں شمس الامراء جیسے ماہر ریاضی و ہندسہ، رفیع الدین خاں عمدۃ الملک جیسے مخیر اور صاحب دل، بدرالدین خاں معظم الملک تیغؔ جیسے شاعر و ادیب، رشیدالدین خاں اقتدار الملک اور محی الدین خاں خورشید جاہ جیسے مدبر اور ریاست داں، منظہرالدین خاں آسماں جاہ جیسے نیک نام بہی خواہ سلطنت، اور فضل الدین خاں وقارالامراء جیسے علم دوست صاحب ذوق اسی خاندان کے قابل فخر افراد ہیں۔ نواب معین الدولہ بہادر کو بھی اس دودمانِ رفیع الشان سے خوش خلقی، شجاعت، علم دوستی اور سخن پروری ورثہ میں حاصل ہوئی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ نواب صاحب نظم اور نثر دونوں پر قادر ہیں۔ اُن کے شکارنامے اُردو ادب میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ وہ جب شائع ہو کر منظرِ عام پر آجائیں گے تو دنیا کو معلوم ہوگا کہ ایک مشرقی امیر کبیر نے فن شکار میں کہاں تک کمال حاصل کیا ہے۔ اور اس کی زندگی کا یہ شعبہ یورپ و امریکہ کے بڑے سے بڑے شکاریوں کے مقابلہ میں بھی کم نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ نواب معینؔ نے نہایت سلیس اور شگفتہ اُردو میں اپنے سیر و شکار کے واقعا

قلمبند فرمائے ہیں اور چونکہ اُردو زبان میں اس قسم کے ادب کی قابل افسوس کمی ہے اسلئے نواب صاحب کے شکارنامے "معین شکار" ثابت ہوں گے اور خاص قدر و منزلت حاصل کرسکیں گے۔

نواب معین الدولہ بہادر کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے شغف رہا۔ اعلیٰحضرت میر محبوب علیخاں غفراں مکاں کا عہد حکومت شعر و سخن کا گہوارہ رہا۔ اس زمانہ میں فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی کا رنگ حیدرآبادی شاعروں اور شعر و سخن کی محفلوں پر چھایا ہوا تھا! اور خود حضرت غفران مکاں کا کلام ملک الکلام بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے بھی اپنی شاعری کا آغاز اسی مقبول عام طرز سے کیا۔ اور چونکہ یہ اَسلوب اُن کی طبیعت کے مناسب بھی تھا اِس لئے وہ برابر ترقی کرتا گیا اور اَب تو نواب صاحب نے اپنے رنگ تغزل میں ایک پختگی پیدا کر لی ہے۔

نواب معین نے زیادہ تر غزلگوئی کی طرف توجہ کی ہے۔ اور یہی وہ صنف سخن ہے جو آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ ہر مبتدی غزلگوئی ہی سے شاعری کا آغاز کرتا ہے۔ لیکن غزل میں اچھے شعر نکالنا اکثر پختہ مشق شاعروں کے لئے بھی مشکل ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ غزل میں ہر شعر آزاد اور مختلف معانی و مطالب کا حامل ہوتا ہے۔ دو مصرعوں کے اندر ایک پوری کیفیت یا جذبہ کو پیش کردینا دریا کو کوزہ میں بند کرنے سے کم نہیں۔ اور پھر کمال یہ ہے کہ کوئی لفظ بھرتی کا نہ ہو اور نہ اَدائی خیال کے لئے کوئی ضروری لفظ چھوٹنے پائے۔ غزل کا بہترین شعر صحیح معنوں میں جامع و مانع ہوتا ہے اور اِس کمال کے ساتھ ہی اِتنا سہل ممتنع کہ پڑھنے والا تو سمجھتا ہے کہ میں بھی ایسا لکھ سکتا ہوں لیکن جب لکھنے بیٹھتا ہے تو طرح طرح کی مشکلیں نظر آتی ہیں۔

بڑی حیرت ہوتی ہے جب "معین سخن" میں متعدد شعر ایسے نظر سے گذرتے ہیں جو صحیح معنوں میں غزل گوئی کا کمال ہیں اور سہل ممتنع اشعار کی بہترین مثال سمجھے جاسکتے ہیں مثلاً۔

ہر ادا آپ کی ہر ایک چلن دیکھ لیا
سادگی دیکھ لی بے ساختہ پن دیکھ لیا

عشق کا راز بھی کیا راز ہے اللہ اللہ
کوئی کافر اسے سمجھا نہ مسلماں سمجھا

کبھی نصیب تھے ہم کو بھی گل کے نظارے
کبھی چمن میں ہمارا بھی آشیانہ تھا

وہ مانیں گے ہماری بات تو مشکل سے مانیں گے
اگر یہ کام نکلے گا بھی تو مشکل سے نکلے گا

ناخدا کی بھی کچھ نہیں چلتی
مہرباں جب خدا نہیں ہوتا

مزہ کیا ہے اگر ہو بے اثر بات
کرے انساں سمجھ کر سوچ کر بات

اسی بشر کو خدائی میں جانئے کمیاب
جسے عروج ملے اور خاکسار رہے

آگیا دل اپنا جس پر آگیا
ہو گئی جس سے محبت ہو گئی

تو ہی جب بے رخی سے ملتا ہے
کون ہم سے خوشی سے ملتا ہے

کچھ تلون مزاج بھی ہے وہ
کچھ زمانے کا انقلاب بھی ہے

تمہاری نظر کا نہیں اعتبار
ابھی یہ ادھر ہے ادھر ہو گئی

نواب معین الدولہ بہادر کے کلام کی پہلی خصوصیت زبان کی شگفتگی اور پاکیزگی ہے اور دوسری سہل ممتنع کلام کی کثرت اور یہ دونوں خصوصیتیں اُن کے کلام میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ وہ صرف اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے شاعری میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کوئی پیشہ ور شاعر تو ہیں نہیں جو تکلفاتِ بارِدہ اور غیر ضروری مبالغہ آرائی سے کام لیکر اپنی استادی کا رعب ڈالنے کی کوشش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ نواب معین کی شاعری میں خود پسندی اور تعلّی کا شائبہ تک نہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں صحیح اور پاکیزہ زبان میں

لکھتے ہیں۔ اور اُن کے اسلوب میں کہیں تعقید یا گنجلک نہیں پایا جاتا نہ تو اپنی زبان اور محاورہ پر گھمنڈ کرنے والے شاعروں کی طرح اُن کا دیوان زبان اور محاوروں کی فرہنگ ہے اور نہ قدرتِ بیان اور وسعتِ معلومات کا رعب گانٹھنے والے شعرا کی طرح اُن کے کلام میں فلسفیانہ اور علمی مسائل یا اَدق اور پیچیدہ ترکیبیں ہی موجود ہیں۔ اس لئے معین سخن میری نظروں میں ایک ایسا خوشبودار اور خوش رنگ گلدستہ ہے جس کو کسی اچھے صاحبِ ذوق نے بہترین اور سرسبز و شاداب باغوں اور چمن زاروں سے چن کر اپنی پاکیزہ طبیعت اور لطیف ذوق کے مطابق تیار کیا ہو مجھے یقین ہے کہ اس کے دیکھنے والے اس کی رنگا رنگی، شگفتگی، اور لطافت سے لطف اُٹھائیں گے اور اس کے مصنف کے پاکیزہ ذوق کی داد دیں گے۔

میں اُردو دُنیا کی طرف سے نواب معین الدولہ بہادر مُعین کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ اُنہوں نے معین سخن کی اشاعت سے اُردو ادب کی زیب و زینت میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور نہ صرف اپنے خاندان کی عظیم الشان ہستیوں بلکہ اُردو کے قابلِ وقعت شعرا کی صف میں بھی ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی۔

لآلیٔ منثور

(دیباچہ لآلیٔ منثور از اکبر سہیل مطبوعہ ۱۹۴۲ء)

اُردو زبان میں کچھ عرصے سے افسانوی ادب کی طرف خاص توجہ کی جارہی ہے اور ہر نوجوان ادیب اپنی کوششوں کا آغاز افسانہ نگاری ہی سے کرتا ہے۔ جس طرح شاعری میں شروع ہی سے غزل گوئی بڑی مقبول رہی ہے اور ہر شاعر نے اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز غزل گوئی ہی سے کیا ہے اُسی طرح آج کل افسانہ نگاروں کا حال ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ جس طرح اصناف شعر میں غزل لکھنا سب سے آسان اور سب سے مشکل ہے اسی طرح نثر میں افسانہ لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ ہر شخص غزل لکھ سکتا یا لکھ لیتا ہے لیکن اُس میں کمال حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اِسی لئے اب تک صرف چند ہی غزل گو اعلیٰ پایہ کے پیدا ہوسکے یہی حال افسانہ نگاروں کا بھی ہے۔ اُردو کے ہر رسالہ میں افسانے چھپتے ہیں اور اگر افسانہ نگاروں کی فہرست مرتب کی جائے تو غزل گویوں سے کم نہ ہوگی لیکن اچھے افسانہ لکھنے والے اب تک چند ہی پیدا ہوئے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب بھی افسانوں اور ادبِ لطیف کے نمونوں کا مجموعہ ہے اور اس کے مصنف مولوی اکبر حسین خاں صاحب سہیل ہیں۔ اُن کی تحریر میں مجھے زندگی اور شگفتگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اگر یہ مشق جاری رکھیں اور اپنی ہر تحریر پر بار بار نظرِ ثانی کریں تو کوئی شبہ نہیں کہ اچھے افسانہ نگار بن جائیں گے۔

اِس مجموعے کے اکثر حصے رسائل میں بھی چھپ چکے ہیں۔ اور نوجوان مصنف نے اب اُن کو کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ یہ نیاز فتح پوری سے متاثر نظر آتے ہیں اور نیاز کی تقلید محمد حسین آزاد کی تقلید کی طرح بڑی حوصلہ شکن ثابت ہوتی ہے۔ عرصہ تک اِس رنگ میں لکھنے والا بھٹکتا رہتا ہے اور اگر اس میں ذوق سلیم نہ ہو تو وہ ہمیشہ بھٹکتا رہے گا۔

سہیل صاحب کے اسلوب میں بھی عربی اور فارسی کی بعض ترکیبیں دیکھ کر پہلے پہلے یہی خیال پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ذوق صحیح سے بے بہرہ نہیں ہیں اور اِسلئے میں نے اِس مجموعہ میں بعض باتیں ایسی دیکھی ہیں جن کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ نوجوان اہل ذوق آخر میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

اِس کتاب میں زندگی کے بعض مسائل پر لطیف پیرایہ میں خیال آرائی کی گئی ہے اور اس کا مطالعہ فرصت کے اوقات کو اچھی طرح سے گذارنے میں معاون ثابت ہوگا۔ کتاب اچھی لکھی اور چھاپی گئی ہے اور اِس قسم کی کتابوں سے اُردو مطالعہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ عہد حاضر میں اُردو کی سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ اُس کے ادب کے خریدار کم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اُردو مطبوعات میں ترقی اور خوبی نہیں ہونے پاتی اِس لئے ہمیں ہر اس کتاب کی قدر کرنی چاہیئے جو اہل اُردو کو مطالعہ کی ترغیب دے اور اپنی زبان کی کتابوں کی طرف متوجہ کرے۔ اُردو کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب جتنی دلچسپی انگریزی رسالوں اور کتابوں میں لیتے ہیں اگر اتنی ہی اُردو رسالوں اور کتابوں سے لینے لگیں تو اُردو کے دِن پھر جائیں گے۔

الخیام

(مقدمہ الخیام از گوربچن لال صاحب آزاد توکلی مطبوعہ ۱۹۳۲ء)

رائے گوربچن لال صاحب آزاد توکلی ملک کے اُن چند مغتنم اصحاب سے ہیں جو قدیم تعلیم وتربیت اور تہذیب وشائستگی کی یادگار رہیں۔ اُن اصحاب میں مذہب وملت کے اختلاف کے باوجود جو خلوص و یگانگت اور مُروت و محبت پائی جاتی ہے، وہ ہمارے دور کے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتوں اور نام نہاد مہذب وشائستہ لوگوں میں نہیں پائی جاتی۔

آزاد صاحب نے جہاں سنسکرت کی تعلیم پائی فارسی کے بھی نہایت اچھے عالم ہیں ہندو فلسفہ کی واقفیت کے ساتھ ساتھ علوم اسلامی کے بھی ماہر ہیں۔ ایسے ہی افراد صحیح ہندوستانی قومیت کے نمونے اور مشترک تہذیب کے علمبردار سمجھے جاسکتے ہیں۔ وہ اُردو کے اچھے شاعر ہیں۔ اور فارسی شاعری کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے عمرخیام کی منتخب رباعیوں کا اتنا کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ ایک زبان کے ادب اور خاص کر شاعری کا ترجمہ دوسری زبان میں کرنا یوں بھی مشکل ہے۔ اور شاعری کا ترجمہ شاعری میں کرنا تو اور بھی دُشوار ہے لیکن گوربچن لال صاحب آزاد کی ہمت اور قابلیت مستحق تحسین ہے کہ اُنھوں نے اس دشوار مرحلہ کو آسانی سے طے کرلیا۔ میں نے اُن کی اکثر رباعیاں دیکھیں اور مجھے اعتراف ہے کہ اُن کی محنت قابل داد اور اُن کی کامیابی قابل رشک ہے۔ ایسا اچھا ترجمہ وہی کرسکتا ہے جو پہلے تو اصل خیام کی رباعیوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہو اور دوسرے اپنی زبان پر پورا پورا

قابو رکھتا ہو۔

عمرخیام کا ترجمہ دنیا کی اکثر ترقی یافتہ زبانوں مین ہو چکا ہے اور اُردو میں بھی اِس سے قبل کوششیں کی گئی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اِتنی کامیاب کوشش اور اِتنی زیادہ رُباعیوں کا ترجمہ اب تک کسی نے نہیں کیا ہے۔ زبان اُردو قابلِ مبارکباد ہے کہ اس کے بُولنے والوں میں اس پرفتن زمانے میں بھی ایسے محسن موجود ہیں اور حیدرآباد خوش قسمت ہے کہ یہاں عہدِ حاضر کی شر انگیزیوں کے باوجود خود ہندوؤں میں ایسے صاحبِ ذوق اور قابلِ قدر پرستارانِ اُردو موجود ہیں۔

نمودِ زندگی

(دیباچۂ مجموعۂ کلام سید علی منظور صاحب حیدرآبادی مطبوعہ ۱۹۴۲ء)

سید علی منظور صاحب جدید حیدرآباد کے پختہ مشق اور مشہور شاعروں میں سے ہیں اور حضرت امجد کی طرح ان کی شاعری کی شہرت صرف اِس سرزمین میں محدود نہیں ہے ان کے کمال کے قدر دان دور دور پھیلے ہوئے ہیں۔ اُردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن اُن کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں۔ اور پھر یہ نظمیں ایک رسالہ سے دوسرے رسالہ میں نقل کی جاتی ہیں۔ ایک شاعر اس سے زیادہ اور چاہتا بھی کیا ہے۔ ہماری زبان کے شاعروں کو تو یہ بھی نصیب نہیں ہوتا!

منظور کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز اُن کی سادگی و پرکاری ہے۔ لیکن یہ پرکاری اکثر معصومیت کے پردے میں چھپی رہتی ہے جس کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ اس کلام کا ایک حصہ "دندانِ تو جملہ در دہان اند" جیسے معصوم و سادہ عنصر پر مشتمل ہوگا۔ لیکن ظاہر بینوں کو کیا معلوم کہ اس خاموش سمندر کی سطح کے نیچے ایک دنیا موجزن آباد ہے؟

زندگی کی ترجمانی شاعر اور ادیب کا سب سے پہلا مقصد ہوتا ہے لیکن کتنے اُردو شاعروں نے اُس اساسی مقصد کا خیال رکھا؟ اور جنھوں نے خیال رکھا اُن میں سے کتنے ہیں جنھوں نے کامیابی حاصل کی؟ علی منظور عہدِ حاضر کے اُن چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں اس مقصد کو پیشِ نظر رکھا۔

اور اُس میں کامیابی بھی حاصل کی۔

اُردو شاعری کا جدید رجحان اِنقلابی قسم کی شاعری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن اِس رجحان کے مطابق جو نوجوان شاعری کر رہے ہیں اُن میں سے اکثر جوش وجذبہ میں آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔ اُن کی حالت مجذوبوں جیسی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن علی منظور جذبات کی رَو میں بہنا نہیں چاہتے۔ بلکہ جذبات کو اپنے قابو میں رکھ کر ایک پختہ گام سالک کی طرح آگے بڑھ رہے ہیں، اور اپنے ساتھ اپنے کلام کا مطالعہ کرنے والوں کو بھی لئے جا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری نوجوانوں کے کلام کی طرح ”مجذوب کی بڑ“ نہیں معلوم ہوتی۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں خود بھی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھنے کا موقع دیتے ہیں یہ ایک فیض جاری ہے جو رہتی دُنیا تک باقی رہے گا۔ اور عہدِ حاضر کی سیاسی و معاشی کش مکش کے بعد بھی اُس کا اثر زائل نہ ہو سکے گا۔ زمانہ سب سے بہترین کسوٹی ہے۔ اور وہی شاعر یا ادیب زندۂ جاوید ہے جس کے کارنامے اِس کسوٹی پر کسے جانے کے بعد بھی اپنی چمک دمک اور قدر و قیمت کو باقی رکھ سکیں گے۔

مکتوباتِ شاد

(مقدمہ مکتوبات شاد عظیم آبادی مطبوعہ سنہ ۱۹۲۰ء)

شاؔد عظیم آبادی کا نام اُردو دُنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ ہماری زبان کے ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ شاعری کے علاوہ تصنیف و تالیف اور فضل و کمال کی وجہ سے بھی اُن کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اُن کے شاعرانہ کمال اور تبحرِ علمی کی اگرچہ اُن کی زندگی میں اُن کے حوصلے کے مطابق قدر نہیں کی گئی لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے یہ مُردہ پرست دنیا اُن کے کارناموں کی صحیح عظمت سے واقف ہوتی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم آباد سے سیکڑوں میل دور حیدرآباد کے ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے اُن کے رشحاتِ قلم کو محفوظ کرنے اور آہستہ آہستہ شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور یہ سعادت راقم الحروف کے نصیب میں لکھی تھی کہ حضرتِ شاؔد جیسے باکمال محسن اُردو کے بلند پایہ خطوط کو مرتب کرکے اِشاعت کے قابل بنائے۔

شاؔد کے حالاتِ زندگی ایک چھوٹی سی کتاب "گلشن حیات" (۱۳۴۴ھ) میں اُنہی کے ایک شاگرد سید معین الدین احمد قیسؔ رضوی عظیم آبادی نے شائع کئے تھے جس کے دوسرے ایڈیشن کا ایک ایسا نسخہ میرے پیش نظر ہے۔ جس میں جگہ جگہ خود حضرتِ شاؔد نے اپنے قلم سے نوٹ[1] لکھے ہیں۔ شاد کی شاعری سے متعلق بھی

---

[1] خلاصہ: ۱ پر جہاں شاد کے اُستاد نواب جعفر حسن خاں فیضؔ کا ذکر ہے اس جگہ حاشیہ پر لکھا ہے۔
(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

عظیم آبادی کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ اور جس انداز میں یہ لکھا گیا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ مضمون نگار شاد مرحوم کے بارے میں ابھی تلاش و تحقیق کر رہے ہیں اُنھوں نے بہت سی بحثیں ایسی چھیڑی ہیں جو معلومات کی کمی کی وجہ سے تشنہ رہ گئی ہیں یقین ہے کہ وہ ان مکتوباتِ شاد کی اشاعت کے بعد شاد کے متعلق ایک مکمل و مبسوط کتاب تیار کر سکیں گے۔ اُن کے اِس مضمون کو دیکھنے کے بعد راقم الحروف نے حیاتِ شاد لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا ورنہ اتفاق سے ادارۂ ادبیاتِ اردو میں ایسا مواد محفوظ ہوگیا ہے جو اس کام کی تکمیل میں بڑا ممد و معاون ہوتا۔

شاد جنوری ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے اور ٹھیک اکیاسی سال کی عمر میں جنوری ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا۔[1]

اُن کے جو خطوط اِس وقت شایع کئے جا رہے ہیں اُن کی مراسلت پچاس سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے اور اُن کے انتقال کے زمانہ تک جاری رہتی ہے اِس مجموعہ کا پہلا خط ۲ جولائی ۱۸۹۶ء کو لکھا گیا تھا جب شاد کی عمر پچاس سال سات ماہ کی تھی۔ اور آخری خط ۱۰ دسمبر ۱۹۲۶ء کو لکھا گیا جس کے بعد شاد صرف دو ہفتے ہی زندہ رہے تیس سال کی مدت اچھی خاصی ہوتی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ یہ زمانہ شاد کی زندگی کے بہترین حصہ پر مشتمل تھا جب کہ وہ

---

[1] اتفاق کی بات ہے کہ شاد نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۲۵ء میں پیشین گوئی کی تھی کہ "ڈیڑھ برس کی ابھی اور حیات باقی ہے" (دیکھو صفحہ ۲۲) لیکن وہ اپنے اندازے سے چار پانچ ماہ زیادہ زندہ رہے۔ ۱۲

تحصیل واکتساب کی منزل سے گذر کر فیض بخشی اور صاحب کمالی کے مرتبہ کو پہنچ چکے تھے۔

یہ تمام خطوط سید ہمایوں مرزا (بیرسٹر) مرحوم یا اُن کی رفیقِ حیات صغریٰ بیگم کے نام لکھے گئے ہیں۔ صرف ایک خط یعنے نمبر (۵۹) احمد علی خاں صاحب کے نام ہے، جس کو خود شادؔ نے ہمایوں مرزا صاحب کے یہاں روانہ کر دیا تھا۔ ہمایوں مرزا حضرت شادؔ کے اُستاد حضرت فریادؔ کے اکلوتے فرزند اور اُن کے بڑے غمگسار و مددگار دوست تھے۔ اِن خطوں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے موقع بموقع شادؔ کی رقمی امداد کی ہے۔ اور آخر عمر میں اُن کے سوا شادؔ کا کوئی مددگار معاون اور بے تکلف دوست نہیں رہا تھا۔ اِسی لئے اُن کے نام جس بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ اُنھوں نے خط لکھے ہیں شاید ہی کسی کو لکھے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ اپنی طبعی خودداری اور آن بان کا بھی خیال نہیں رکھا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"سب سے بڑھ کر میرے لئے آپ ہیں۔ بخدا میں اپنی حالت بھائی اور بیٹے پر تمام ظاہر نہیں کر سکتا اِلّا آپ پر۔ چاہے کامیابی ہو نہ ہو میرے لئے کوئی ذلت نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کس شخص نے میرے داماد سید جعفر صاحب کو لکھیم پور میں میری اِن دنوں کی تکلیف کا حال لکھ بھیجا تھا۔ اُنہوں نے تین سو روپے میرے پاس بلا اظہار کسی اَمر کے بھیج دیئے۔ اِس قدر رنج ہوا کہ کھانا نہ کھایا گیا۔ روپے واپس کئے اور لکھا کہ آپ نے مجھ کو فقیر بے حیا سمجھا۔ آئندہ پھر ایسا نہ کیجئے گا۔" (خط نمبر ۵۲ صفحہ ۲۲۳)

خطوط کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ۱۹۲۲ء یعنے انتقال سے پانچ سال پیشتر سے ہمایوں میرزا مرحوم سے اُن کی مراسلت بہت زیادہ ہوگئی تھی کیونکہ

بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ پچاس ساٹھ جز سے زیادہ تو حضرت کا کلیات
مشتمل بر غزلیات و خمسہ جات و رباعیات و قطعات وغیرہ ہے۔ ڈیڑھ سو
سے زیادہ مرثیے ہیں، اور کوئی مرثیہ سوا سو بند سے کم نہیں ہے، نثر کی
کتابوں کا ایک معتدبہ ذخیرہ ہے۔ یہ کل چیزیں انشاء اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ
چھپوانی ہیں۔"

لیکن ہماری نظروں میں حضرتِ شاد کے یہ خطوط اُن کے کلام کے بعد اُن کی جملہ تحریروں سے زیادہ اہم ہیں۔ خطوط کیا ہیں معلومات کا ایک بحرِ بیکراں ہے جو موجزن ہے۔ اَدبِ اُردو کی تاریخ لکھنے والے اُن کے مطالعہ سے ایسی ایسی ضروری اور نایاب معلومات اور مواد حاصل کریں گے جو اُردو کے کسی اور اَدیب کے خطوط میں نہیں مل سکتا۔ یہ خطوط صحیح تنقید اور ذوقِ اَدب کے ایسے گراں بہا مضامین ہیں جن کا مطالعہ اُردو اَدب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ بعض خط تو کتابچے کے تقریباً بیس بیس صفحات پر مشتمل ہیں۔ اِتنے طویل خط شاید ہی اُردو کے کسی اور اَدیب کے مجموعۂ مکتوبات میں مل سکیں۔

اِن خطوط کے مطالعے سے عظیم آباد کے علمی و اَدبی ماحول اور وہاں کے بعض شریف و متمدن خاندانوں کی نسبت بھی بڑی کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ شاد عظیم آبادی کو تاریخ سے خاص لگاؤ تھا۔ اِس لئے جگہ جگہ اُن کے قلم نے اہم تاریخی معلومات محفوظ کر دی ہیں۔ مرثیہ نگاری اور لکھنو کے مشہور مرثیہ نگاروں کے بارے میں بھی شاد نے جو پتہ پتہ کی باتیں اِن مکتوبات میں قلمبند کر دی ہیں وہ کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔

سب سے آخر میں لیکن سب سے زیادہ اہم معلومات خود شاد کے متعلق اِن خطوط میں موجود ہیں اُنھوں نے اپنے متعلق جتنا اپنے ان خطوط میں لکھا ہے شاید ہی کسی اور جگہ لکھا ہو۔ یوں بھی طبعاً وہ اپنی ذات کے متعلق کہنے اور لکھنے کی طرف زیادہ مائل تھے لیکن اِن خطوط میں تو بعض جگہ اتنا زیادہ لکھ گئے ہیں کہ وہ خود نمائی کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اور یہ سب باتیں اُن کے سوانح نگار کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوں گی کیونکہ صرف اِن خطوط ہی کی مدد سے حضرت شاد کی ایک بسوط و مستند سوانح عمری مرتب کی جا سکتی ہے۔ اُن میں اُنھوں نے اپنے خاندان، ماحول، تعلیم و تربیت، اساتذہ، شادی آل و اولاد، آمدنی، طرزِ معاشرت، اخلاق و عادات، دوست احباب، تلامذہ، تصنیفاتِ نثر، شاعری، مرثیہ نگاری، غرض ہر موضوع پر اتنا لکھ دیا ہے کہ اور ذریعۂ معلومات پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اِن مکتوبات کے مرتب کرتے وقت شاد مرحوم کی حسب ذیل تحریر بھی میری نظر سے گذری کہ:-

"ہاں اکثر اہلِ قلم آپ سے میرے خطوط اردو ضرور مانگیں گے تاکہ پرچوں میں درج کریں مگر اُمید ہے کہ آپ احتیاط فرمائیں گے۔ خدا جانے میں آپ کو کیا کیا لکھ دیا کرتا ہوں۔ اور آپ پر مجھ کو کیسا بھروسہ ہے جو غیروں پر کیا معنی عزیزوں پر بھی نہیں ہو سکتا۔ کل بھی خبر سنی کہ ایک مولانا صاحب جو پرچہ نکلنے والے ہیں وہ میرے خطوط کی نقل کی خواستگاری آپ سے کرنے والے ہیں۔" (۲۰ فروری ۱۹۲۲ء صفحہ [illegible])۔

لیکن اَب کہ کاتب اور مکتوب الیہ دونوں باقی نہ رہے (رہے نام اللہ کا۔)

اِن خطوں کو محض اُردو اَدب کی وسعت اور اہلِ اُردو کے اِستفادہ کی غرض سے شایع کیا جا رہا ہے۔ وَرنہ قوی اَندیشہ تھا کہ یہ تلف ہوجاتے اور اُردو اپنے ایک بہت بڑے اِنشا پرداز، شاعر اور محسن کے رشحاتِ قلم سے محروم رَہ جاتی۔ اِن خطوط کا مطالعہ ظاہر کردے گا کہ شاد عظیم آبادی اپنی تصنیف و تالیف میں کیسی تلاش و جستجو اور سرگرمی سے کام لیا کرتے تھے۔ اَسّی برس کی عمر ہوچکی تھی لیکن اُن کے ایک ایک جملہ سے کام کرنے کا ولولہ، محنت و مشقت کی عادت، اور اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر مضطربانہ سرگرمی جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہی وہ باعظمت شخصیتیں ہیں جن کی زندگی نوجوانوں کے لئے دَرسِ عبرت، گمراہوں کے لئے شمعِ ہدایت، اور بوڑھوں کے لئے سرچشمۂ بصیرت ثابت ہوتی ہے۔

اِس کی اِشاعت سے یہ مطمحِ نظر واضح ہو جائے گا کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو جہاں قدیم اور گذرے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کو بے نقاب کر رہا ہے نئے نئے شاعروں اور ادیبوں کے نورس رشحاتِ قلم کو بھی اُردو دُنیا میں روشناس کرنا چاہتا ہے۔

کیا تعجب ہے کہ اِس طرح کی ہمت افزائیاں اِس خطۂ ملک کی فن کارانہ قابلیتوں اور تخلیقی قوتوں کے جگا دینے کا باعث ہوں۔

میں قحط الرجال ہوجاتا ہے جب تک ہم ترقی یافتہ اور زندہ قوموں کی طرح ذاتی اختلافات اور تعصبات سے قطع نظر کرکے اپنے ہمعصروں کی خدمات کا اعتراف اور اُن کے کام کی قدر کرنا نہ سیکھیں گے ہم میں ہمیشہ قحط الرجال رہے گا۔

ادارۂ ادبیات اُردو نے اِسی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھکر تہیّہ کیا ہے کہ چند ایسے نوجوانوں کی نظم و نثر کے مجموعے شائع کئے جائیں جو خاطر خواہ قدر دانی کے بعد یقیناً اُردو زبان کے سچّے خدمت گزار ثابت ہوسکیں گے۔

محمد حسین آزاد

(دیباچۂ عمومی محمد حسین آزاد از جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم۔ اے مطبوعہ ۱۹۶۱ء)

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اردو کے اُن مخصوص محسنوں میں سے ہیں جن کا نام اور خدمات تاریخ ادب اردو کا جزو لاینفک ہیں لیکن یہ ہماری زبان کی بدقسمتی ہے کہ اُس کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے متعلق اَب تک جیسا چاہیے کوئی کام نہیں کیا گیا۔ نہ اُن کے سوانح حیات شایع ہوئے اور نہ ہی اُن کے کارناموں کا تجزیہ کر کے اُن کی حقیقی عظمتوں اور حیثیتوں کو اُجاگر کیا گیا۔

یہ ہمارا سب سے پہلا فریضہ ہے کہ نام نیک رفتگاں کو ضایع نہ ہونے دیں، اُن کی حیات اور کارناموں کے مطالعہ سے مستفید ہوتے رہیں اور اپنے مستقبل کے بنانے میں اُن سے سبق حاصل کریں۔ آزاد کی اہمیت اُردو ادب میں مُسلّم ہے، لیکن کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ آج تک کسی نے اُن کے سوانح حیات کے مُرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ابھی حال میں ایک کتاب "آبِ حیات کے لطیفے" شایع ہوئی ہے، جس کے دیباچہ میں آزاد کے کچھ حالاتِ زندگی بھی آ گئے ہیں، لیکن مستقل سوانح حیات کی ضرورت باقی تھی، جس کو ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے شعبۂ نسواں کی سرگرم رُکن محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم۔ اے نے نہایت خوش سلیقگی اور کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ اصل میں وہی "ج۔ نقوی" ہیں جو حیدرآباد کی مشہور ادیبہ اور کئی مُفید و دلچسپ کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ "رفتارِ خیال" اِن کے

اعظم الامرا ارسطو جاہ

(دیباچۂ اعظم الامرا ارسطو جاہ از پروفیسر مجید صدیقی صاحب مطبوعہ ۱۹۳۹ء)

اعظم الامرا ارسطو جاہ ہندوستان کے اُن مشاہیر سے ہیں جنھوں نے اِس ملک کی تاریخ کے بنانے میں حصہ لیا ہے۔ دکن میں انگریزوں کے اقتدار کے استحکام میں اُن کے تدبر اور حکمتِ عملی کو بھی بڑا دخل ہے۔ میسور کی سلطنت کے زوال کی ذمہ داری بھی ایک حد تک اُن کے سر ہے۔ مرہٹوں کی تاریخ تو اُن کے تذکرے کے بغیر لکھی ہی نہیں جا سکتی اور حیدرآباد کی سلطنت کی تعمیر و تشکیل میں بھی اُنھوں نے جو اہم خدمات انجام دی ہیں اُن کا ایک معمولی اندازہ اُن عظیم الشان خطابات ہی سے ہو سکتا ہے جو اُن کے نام کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔

حیدرآباد کی تاریخ میں مختار الملک سر سالار جنگ اعظم کے علاوہ کوئی شخصیت ایسی نہیں ملتی جس میں ارسطو جاہ جیسی فراست، بلند حوصلگی، اور معاملہ فہمی پائی جاتی ہو۔ اُن کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کے سخت سے سخت دشمن بھی جب اُن سے ملتے تو اُن ہی کا سبق پڑھنے لگتے نواب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی تو اُن کو اتنا چاہتے تھے کہ جب اُن کے فرزند سیف الدولہ کا انتقال ہوا تو اپنے فرزند رئیس الملک سلیمان جاہ کو اور بعد کو جب ارسطو جاہ کی پونہ والی بیگم کے لڑکے کا بھی انتقال ہو گیا تو دوسرے صاحبزادے سیف الملک کیواں جاہ کو بھی اُنہی کی فرزندی میں دیدیا۔

ارسطو جاہ بڑے معاملہ فہم اور مردم شناس آدمی تھے۔ اور چونکہ چھوٹے درجہ سے سلطنت کے عظیم ترین رتبہ کو پہنچے تھے اس لئے شریفوں کی اور باکمالوں کی امداد اور اعانت کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ان کی داد و دہش اور شرفا پروری کا شہرہ دور دور پہنچ چکا تھا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ ان کے یہاں چلے آتے تھے۔ خود ان کا دربار بادشاہوں کے دربار سے کم بارونق نہ تھا۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کو بذلہ سنجی، علم و فضل اور شعر و سخن کا بھی بڑا اچھا ذوق تھا۔ اور دراصل یہی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ صرف اسی کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے۔ ان کے دربار میں حیدرآباد اور ہندوستان کے بیسیوں بلند پایہ شعرا مثل احسن اللہ خاں بیان مرزا علی لطف شیر محمد خاں ایمان اور شاہ تجلی علی تجلی وغیرہ جمع تھے جنھوں نے اپنے قصیدوں میں ان کی زندگی کے متعلق ایسا تفصیلی مواد محفوظ کر دیا ہے کہ بڑی سے بڑی تاریخوں میں اتنی مکمل اور مفید معلومات قلمبند نہ ہو سکتی تھیں۔

شاعروں ادیبوں اور مصوروں کے فیاض قدردان ہونے کے علاوہ ارسطو جاہ خود بھی شاعر اور صاحب علم و فضل امیر تھے۔ چنانچہ جب ان کو ایلگندل میں جاگیر ذات مرحمت ہوئی تو انھوں نے فی البدیہہ ایک قطعہ تاریخ نکالا تھا کہ:۔

وَ اِن شَکَرتُم لَاَزِیدَنَّکُم (۱۱۷۹ھ)

علمی و ادبی ذوق کے علاوہ ارسطو جاہ کو تعمیر کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ سرور نگر کے سنگ بستہ حصار اور برجوں کو ۱۲۱۳ھ میں انہی نے بنایا تھا۔ یہ اصل میں ایک گاؤں تھا جو

ارسطو جاہ کی منکوحہ سرور افزا بیگم کو آصفجاہ ثانی نے بطور جاگیر عنایت کیا تھا۔ اسی طرح حسین ساگر کے قریب اس وقت جو محلہ مشیرآباد واقع ہے وہ بھی دراصل انہی کا سنہ ۱۲۱۲ھ میں بسایا ہوا ایک گاؤں تھا جو آب تک اُن کے خطاب مشیرالملک کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

غرض ایک ایسی عظیم الشان شخصیت کے سوانح حیات مرتب کرنا ملک اور تاریخ کی ایک مفید خدمت ہے جس کو پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت خوبی سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے یہ کام اگرچہ آج سے چھ سال پیشتر شروع کیا تھا چنانچہ اُن کا ایک بسیط مضمون رہبر کے سالنامہ بابت سنہ ۱۹۳۳ء میں شایع ہو چکا ہے لیکن ادارۂ ادبیات اردو کی خواہش پر اُنھوں نے اب اس میں اضافہ کر کے اُس کو ایک کتاب کی شکل دیدی ہے۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ صدیقی صاحب کی مشہور تاریخ گولکنڈہ کے بعد ہی حیاتِ ارسطو جاہ شایع ہو رہی ہے۔ ارسطو جاہ میں اور قطب شاہی سلاطین وامرا میں مجھے کئی طرح کی مناسبت نظر آتی ہے۔ وہی اعلیٰ ادبی ذوق، وہی فیاضی اور داد و دہش، وہی قدردانیٔ فضل و کمال، وہی شرفا نوازی، وہی شگفتگیٔ طبع، وہی فراخ حوصلگی، اور وہی وسیع المشربی سچ تو یہ ہے کہ جب میں ارسطو جاہ کے حالاتِ زندگی پڑھتا ہوں تو مجھے قطب شاہی دور کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے۔

سر سالار جنگؒ اعظم

(دیباچہ عمومی سر سالار جنگ اعظم از فیض محمد صاحب صدیقی مطبوعہ ۱۹۳۹ء)

نواب مختار الملک شجاع الدولہ میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اعظم دُنیا کے اُن مُدبرین و مُفکرین میں سے ہیں جو کسی ملک و قوم میں بار بار نہیں پیدا ہوتے اور جب کبھی بخت و اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں تو اپنے ملک یا قوم کو جہالت و اِدبار اور تنزل و گمنامی سے نکال کر ہمہ جہتی ترقیوں اور شہرت و عظمت کے بامِ عروج تک پہنچا دیتے ہیں۔

حیدرآباد کی سرزمین نے بہت کم ایسے سپوت پیدا کئے اور یہ اس ملک کی خوش قسمتی تھی کہ ایک نہایت ہی نازک دَور میں اُس کو مختار الملک جیسا محبِ وطن، مدبر اور مصلحِ اعظم مل گیا۔ مختار الملک کے کارنامے اِس سلطنتِ اَبد مُدت کی تاریخ میں ہمیشہ زرین حروف میں لکھے جائیں گے۔ اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا جائیگا حیدرآبادیوں کے دِلوں میں اپنے اس رفیع الشان ہم وطن کے احسانات کی یاد تازہ ہوتی جائے گی۔

ایسی ہی عظیم المرتبت شخصیتوں کے حالاتِ زندگی پڑھنے سے گرتی ہوئی قومیں سنبھل جاتی ہیں اور سوتے ہوئے ملک جاگ پڑتے ہیں۔ اِسی خیال کو پیش نظر رکھ کر ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے شعبۂ تالیف و ترجمہ نے بچوں، بچیوں اور عوام کے لئے یہ چھوٹی سی کتاب مرتب کرائی ہے اور اُس کو یقین ہے کہ اِس کا مطالعہ پڑھنے والوں

کے دلوں میں ملک کی محبت، کام کرنے کا ولولہ، بردباری، مستقل مزاجی، مخالفتوں اور دشواریوں کے باوجود آگے بڑھتے چلے جانے کی ہمت پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

اس کتاب "سر سالار جنگ اعظم" کے مرتب مولوی ابو المکارم فیض محمد صاحب بی اے۔ ڈپ۔ ایڈ ہیں جن کو سوانح نگاری میں خاص کمال حاصل ہے چنانچہ مشہور معلمانِ تعلیم کی سوانح عمریوں کے علاوہ ان کی لکھی ہوئی حیاتِ "ابن سعود" بھی شائع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدر آباد کے اس محسنِ اعظم کے حالات کو مختصر سے مختصر طور پر قلم بند کرنے کے لئے ادارہ نے انہی کا انتخاب کیا۔ زیادہ سے زیادہ معلومات کو کم سے کم الفاظ میں پیش کرنا ایک کمال ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ تالیف و ترجمہ نے اردو ترجموں کے سلسلے میں مفید کتابوں اور مضمونوں کی تیاری و اشاعت کے علاوہ یہ بڑا اچھا کام شروع کیا ہے کہ اس کی طرف سے دوسری زبانوں کی کتابوں سے اخذ کر کے یا اپنے طور پر ایسی چھوٹی چھوٹی کتابیں اردو میں پیش کی جا رہی ہیں جو بچوں، بچیوں اور عوام کے ادب میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔

کے بیسیوں طلبہ اور فیض یافتہ اصحاب کے مضامین کے مجموعے اور کتابیں شایع ہو چکی ہیں اور اب اِس جامعہ کی جماعت ایم' اے کی طالبات کے مضامین کا یہ پہلا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اِس میں حضرت ولی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر چار مبسوط تنقیدی مضمون شامل ہیں جو کافی توجہ اور ذوق کا نتیجہ ہیں۔ ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ولی واقعی استاد الاساتذہ اور آدم اردو تھے اُن کے کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو اب پھر اُردو شاعری میں جگہ حاصل کر رہی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ اُنھوں نے اِس نازک دَور میں فارسی کے مقابلہ میں اُردو کو بچا لینے کی جو سعیٔ بلیغ کی تھی وہ کتنی مستحکم بنیادوں پر مبنی تھی کیونکہ آج ہندی کے مقابلہ میں اُردو کو بچانے کے لئے جو تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں اور زبان کی اِصلاح کی طرف جو توجہ ہے وہ انہی اصولوں پر مشتمل ہے جن پر ولی نے عمل کیا تھا۔

ولی نے اُردو کو تمام ہندوستان میں عام فہم بنانے کی خاطر اِس کو صوبجاتی قید و بند سے آزاد کیا۔ دکنی عنصر کم کر کے اِس میں شمال کے روزمرہ کو بھی شامل کر لیا۔ اور اِس کے علاوہ ایسے ہندی الفاظ رائج کر دئے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کے لئے ضروری تھے۔

اِن مضامین میں ولی کی معلومات، اُن کے تخیل، اُن کے فنِ شعر اور ذوقِ عرفان کے علاوہ اُن کے اسلوب، زبان اور اِنتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحثیں کی گئی ہیں۔ اُردو ادب اور شاعری کا ذوق رکھنے والے اصحاب اُن کے مطالعہ سے ضرور بہرہ مند ہوں گے۔

تاریخِ اَدبِ اُردو

(دیباچہ تاریخِ اَدبِ اُردو مطبوعہ سنہ ۱۹۳۰ء)

ادارۂ اَدبیاتِ اُردو نے کئی سال قبل دُنیا کی چند اہم زبانوں کی اَدبی تاریخوں کی اشاعت کا تصفیہ کیا تھا۔ اور یہ کام مختلف اصحاب کے سپرد کر دیا گیا تھا مقصد یہ تھا کہ اہم زبانوں کی ایسی مبسوط تاریخیں لکھی جائیں جن میں ہر دَور کی خصوصیتوں رجحانوں اور اہم تحریکوں کے ساتھ ساتھ شاعروں اور انشاء پردازوں کے حالات اور اُن کی خدمات کا مفصل تذکرہ درج ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر مولوی میر حسن صاحب ایم' اے تاریخِ اَدبِ انگریزی' مولوی سید ابوالفضل صاحب ایم' اے تاریخِ اَدبِ عربی' اور پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری تاریخِ اَدبِ ہندی کی ترتیب میں مصروف ہیں اور اول الذکر صاحب نے تو اپنی کتاب مکمل بھی کر لی ہے اُردو اَدب کی تاریخ کا کام میں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ اگرچہ اس موضوع پر دو چار کتابیں چھپی ہیں، لیکن اَدبیاتِ اُردو کی تاریخ جیسی کہ چاہیئے اَب تک نہیں لکھی گئی۔ یہ کام یوں بھی دیر طلب تھا اور پھر میری دوسری مصروفیتوں نے اس میں اور تعویق پیدا کر دی۔ میں نے اپنا کام اگرچہ ختم کر لیا ہے۔ لیکن کتاب اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اس کی طباعت کے لئے عرصہ درکار ہوگا۔ اس اثناء میں ادارۂ اَدبیاتِ اُردو کے امتحانوں (اُردو عالم اور اُردو فاضل) کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی لیکن اچھی تاریخ کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ اسی

ضرورت کی تکمیل کے لئے یہ چھوٹی سی کتاب ادارہ نے مرتب کرا دی ہے۔ پہلے خیال تھا کہ ڈاکٹر بیلی کی انگریزی کتاب کو اردو میں منتقل کر دیا جائے، لیکن جب اِس خیال سے کام شروع کیا گیا تو محسوس ہوا کہ اُس میں بعض غیر ضروری بحثیں درج ہیں اور بعض ایسی تحریکیں اور اہم معلومات شامل نہیں ہیں جن کے بغیر تاریخ ادب اردو لکھنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے ترجمہ کا خیال ترک کر کے تالیف کا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔

اِس کام میں ادارہ کے مختلف کارکنوں نے مدد فرمائی اور خاص کر پروفیسر مولوی سید محمدؐ صاحب ایم، اے نے بہت ہاتھ بٹایا ورنہ یہ کتاب وقت پر شایع نہ ہو سکتی۔

اِس کی ترتیب میں یوں تو بہت کچھ ڈاکٹر بیلی کی تاریخ ادب اردو سے فائدہ اُٹھایا گیا لیکن دوسری مطبوعہ تاریخوں اور تذکروں اور خود میرے مسودہ تاریخ ادب اردو کے مطالعہ کے نتیجے بھی اِس میں جگہ جگہ شامل ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اِس کی ترتیب بالکل تحقیقی اور سائنٹیفک بنیاد پر کی گئی ہے۔ اِس معاملہ میں ڈاکٹر بیلی کی تاریخ بہت پیچھے ہے کیونکہ اس میں زبان اور خیالات کی تبدیلیوں اور فطری ارتقاء کے مطابق دَور نہیں بنائے گئے ہیں۔

صحیح معنوں میں ملک الکلام ہے۔ اُردو شعر و سخن کی تاریخ میں آپ کا نام ہمیشہ زریں حروف میں چمکتا رہے گا یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بناء پر" ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد کے ممتاز شعرائے آصفیہ کا باتصویر تذکرہ مُرقعِ سخن مرتب کر کے اعلیٰحضرت کے پچیس سالہ دَورِ حکمرانی و سخن پروری کے جشنِ سیمیں میں حصّہ لے رہا ہے۔

اِس باتصویر تذکرہ مُرقعِ سخن میں اعلیٰحضرت سُلطان العلوم کی پچیس[۲۵] سالہ جوبلی کی مناسبت سے حیدرآباد کے پچیس[۲۵] ہی اُردو شاعروں کے حالات معہ نمونہ کلام مندرج ہیں۔ سلاطین آصفیہ کے زیرِ سایہ گذشتہ سوا دو سو سال کی مدت میں سیکڑوں بلند پایہ شعرا حیدرآباد میں پیدا ہوئے، اور سیکڑوں ہی بیرونِ ملک سے ان علم پرور فرمانرواؤں اور اُن کے سخن دوست امراء کی سرپرستی شعر و سخن سے مستفید ہونے کی خاطر حیدرآباد آئے۔ اُن سب کے حالات اور کلام پر ایک ہی جگہ تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اِس موقع پر صرف پچیس شاعروں سے متعلق یہ پہلی قسط پیش کی جا رہی ہے۔ اگر اُس کی کما حقہٗ قدر کی گئی تو متعاقب اس کے دوسرے حصص بھی منظرِ عام پر آئیں گے جن میں حیدرآبادی شعراء کے علاوہ شمالی ہند کے ایسے شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام بھی درج ہوگا جنھیں قدردانی کی شہرت حیدرآباد لے آئی اور جو یہیں کے ہو رہے۔ اِس طرح دکن کی اُردو شاعری کی ایک مکمل تاریخ اور یہاں کے باکمال شاعروں کا ایک مبسوط تذکرہ مرتب ہو جائے گا۔

حیدرآباد کی اُردو شاعری فطرتی طور پر دو جدا جدا حصّوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ پہلا حصّہ عہدِ قطب شاہیہ کی شعری پیداوار پر مشتمل ہے اور دوسرے میں عہدِ آصف جاہیہ کے گنجینہ ہائے شعر و سخن شامل ہیں۔ پہلے حصّہ کی نسبت اِس وقت

ایک تمہید سے شروع ہوتا ہے جس میں اُسی زمانہ کے قدر دانانِ سخن کے نام، شاعری کی خصوصیات، اور مشہور شاعروں کی فہرست درج ہے۔ حیدرآبادی شعراء کے علاوہ ان شاعروں کے نام بھی لکھے گئے ہیں جو اُس زمانہ میں باہر سے حیدرآباد آئے اور ہر تمہید کے آخر میں شمالی ہند کے اُن مشہور اساتذۂ سخن کے نام بھی بتلا دئے گئے ہیں جو اُس دَور کے شعرائے حیدرآباد کے معاصر تھے۔ اِس صراحت سے اس مُرقع کے مطالعہ کرنے والوں کو اُردو کے اُن تمام شاعروں کے متعلق تاریخ وار علم حاصل ہوگا جنھوں نے گذشتہ سوا دو سو سال میں اپنے مسلسل خدمات اور گراں بہا کارناموں کی وجہ سے زبانِ اُردو کو دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلّہ بنا دیا۔

اِس مُرقع میں اُن شاعروں کی تصویروں کے علاوہ جن کا تذکرہ درج کیا گیا ہے، ہر دَور کے قدر دانانِ شعر و سخن یعنے سلاطین آصفیہ اور وزرا و امرا کی تصاویر بھی شریک ہیں۔ نیز ہر دَور کے اُن جملہ معاصر شعراء کی تصاویر کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کے نام تمہیدوں میں درج ہیں۔ تصاویر کی فراہمی اور طباعت کے اِنتظامات میں خاص زحمت اُٹھانی پڑی ہے۔ ادارہ نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب اور مولوی سراج الدین صاحب طالبؔ کا شکر گذار ہے کہ اُنھوں نے اِس بارے میں ادارہ کی مدد کی۔ اِس خصوص میں مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب کی امداد بھی قابلِ تحسین ہے۔

مرقع کے جملہ مضمون نگار جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ یا متعلم ہیں اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے ممد و معاون۔ مضامین میں اِس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ

ممکن ہے کہ اِنہی شاعروں سے متعلق مزید تحقیق و تفتیش کے ذرائع سے اور زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں اور اُن کے کلام کے ایسے مجموعے بھی مل سکیں جو اِس وقت دستیاب نہ ہو سکے۔ یہ بعد میں کام کرنے اور دکن کی اُردو شعر و شاعری سے ذوق رکھنے والوں کا کام ہے کہ وہ ان ابتدائی تعارفی مساعی کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوں اور ان میں سے ہر شاعر پر ایک جداگانہ کتاب مُرتب کریں۔

لیکن اِس کا اِمکان ہے کہ بعض ایسے شاعر رہ گئے ہوں جنھیں اِس تذکرہ میں
شریک کیا جاسکتا تھا۔ جو نظمیں شامل ہیں وہ زیادہ تر خود شعراء کی منتخب کی ہوئی
ہیں۔ یا جن کی ترتیب میں مرتبین نے اپنے اِنتخاب کے ساتھ اُن کی رائے
کو ملحوظ رکھا ہے۔ بعض شعراء مثلاً وجدؔ، برقیؔ، اور مخدوم وغیرہ نے خود ہی
اپنے کلام کا پُورا پُورا اِنتخاب روانہ کیا اور ان کی خواہش کے مطابق مرتبین
نے اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا اِضافہ نہیں کیا ہے۔

ہر شاعر کے کلام میں سے اَوسطاً دس نظمیں اور پانچ غزلیں پیش
کی گئی ہیں تاکہ ہر ایک کے دل و دماغ اور خصوصیاتِ کلام کا کافی اندازہ
ہو سکے۔ نظموں اور غزلوں میں اگر کوئی مقام نظرِ ثانی کے محتاج تھے تو
اُن کو یا حذف کر دیا گیا ہے یا خود مصنف کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا گیا ہے۔
البتہ کہیں کہیں طویل نظموں یا غزلوں کے اِقتباس لینے میں مُرتبین نے
اپنے حقِ اِنتخاب سے کام لیا ہے۔

اِس مجموعہ میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں طرح کا کلام شامل ہے۔ جن شعراء
کا کلام پیش کیا گیا ہے اُن میں بعض مثلاً امیرؔ، شمیمؔ اور بیکسؔ وغیرہ کے تو
مجموعے بھی شایع ہو چکے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں مثلاً میر حسن الدین
رشدیؔ، ڈاکٹر بدرؔ، اور اکبر وفاقانی وغیرہ جنھوں نے راقم الحروف کی طرح
اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے شعر گوئی کم کر دی یا چھوڑ دی ہے لیکن
شاعر کی حیثیت یا تخلص کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ اَمر بھی
قابلِ اظہار ہے کہ طیلسانئین یا عثمانیہ کے طلبۂ قدیم کے ساتھ ساتھ دو عثمانی

نہیں ہیں۔ اس لئے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے "سائنس کے کرشمے" کے عنوان سے یہ کتاب شایع کی جا رہی ہے جس میں ہوا، پانی، بجلی، ہوابازی ٹیلی ویژن اور ربر جیسے موضوعوں پر ماہرینِ سائنس کے مضامین درج ہیں۔ اور آئندہ ایسے ہی ضروری موضوعوں پر چھوٹے چھوٹے رسالے اور مجموعے بھی شایع ہو سکیں گے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا شعبۂ سائنس ایسے ماہرینِ فن پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے موضوع میں امتیاز حاصل کیا ہے اور توقع ہے کہ یہ شعبہ بہت جلد اردو میں سائنس کی دقیق سے دقیق معلومات و اکتشافات کو سہل اور سادہ زبان میں منتقل کر دے گا۔

آب دوز اور سُرنگ وغیرہ

(دیباچہ عمومی پانی کی کہانی اور آب دوز و سُرنگ وغیرہ از مولوی فیض محمدؐ صاحب صدیقی مطبوعہ ۱۹۴۰ء)

سائنس اور عام فہم سائنس پر اُردو میں بہت کم کتابیں ہیں جس کی وجہ سے اُردو داں حضرات کو سائنسی ترقیوں سے واقفیت حاصل کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اِس سلسلے کی اشاعت کی غرض صرف یہی ہے کہ عام اُردو جاننے والوں اور اُن طلباء کو جو سائنس پڑھتے ہوں، سائنس کی بڑھتی ہوئی ترقیوں سے واقف کرایا جائے تاکہ وہ اپنے ماحول کو اچھی طرح سمجھکر لطف اندوز ہوسکیں۔

اِس میں شک نہیں کہ سائنس نے اِس دَور میں خاصی ترقی کرلی ہے اور اُس کا معیار اِتنا بلند ہوگیا ہے کہ اس کے اُصولوں کو اور عمل کو سمجھنا آسان بات نہیں۔ لیکن ہم اِتنا ضرور کرسکتے ہیں کہ اُن اساسی باتوں کو معلوم کرلیں جو ان تحقیقات اور ایجادات کی بنیاد ہیں اور پھر ساتھ ہی اُن کے اِستعمال سے بھی واقف ہو جائیں اور یہ دیکھیں کہ وہ ہماری رُوزمرہ زندگی سے کس طرح وابستہ ہیں۔ عہدِ حاضر میں ہوائی جہازوں، آبدوز کشتیوں، ریڈیو، دور نمائی، ریڈیم، لاشعاعوں اور دیگر بیشمار ایجادات واختراعات سے واقفیت نہ رکھنا اپنے آپ کو اُن کے فائدوں سے محروم کرلینا ہے۔

اِس مقصد کو پیش نظر رکھکر ادارۂ اَدبیاتِ اُردو نے ایسی چھوٹی چھوٹی کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا ہے جن کو ہر اُردو داں آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے۔ ہر کتاب ایک خاص سائنسی موضوع کو عام فہم زبان میں پیش کرتی ہے اور اس میں ٹھوس

فنِ تقریر

(دیباچۂ عمومی فنِ تقریر مطبوعہ سنہ ۱۹۴۰ء)

اِنسان حیوانِ ناطق ہے۔ اِس بولنے والے جاندار کو دُنیا کی دوسری مخلوقات پر اِسی وجہ سے اِمتیاز حاصل ہے کہ وہ بول سکتا ہے۔ اس کے اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا اہم سبب اُس کا نطق سے سرفراز ہونا ہی قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو اِنسان بہت اچھا بول سکتا ہے وہ دوسرے اِنسانوں پر یقیناً فضیلت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجی گفتگو ہو یا مجمع کی تقریر دونوں موقعوں پر وہی شخص بازی لیجاتا ہے جس کو اپنی قوتِ گویائی پر قابو ہوتا ہے اور جو اپنے خیالات کو ایک خاص سلیقے اور خوبی کے ساتھ دوسروں پر ظاہر کر سکتا ہو۔

دُنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جن قوموں نے عروج حاصل کیا اور سماجی نقطۂ نظر سے کامیاب اور شائستہ زندگی بسر کی اُنہی میں اعلیٰ درجے کے مقرر پیدا ہوئے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوتِ تقریر میں کمال پیدا ہونا اِنتہائی تہذیب و شائستگی کی دلیل ہے۔ عربوں، یونانیوں، رُومیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں میں جتنے بڑے بڑے مقرر پیدا ہوئے دنیا کی دوسری قوموں میں اُنکی نظیر نہیں ملتی۔ اور یہی وہ قومیں ہیں جنھوں نے اِنسان کی تاریخ اور تمدن کے بنانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

غرض اِنفرادی کامیابی ہو کہ اجتماعی دونوں کے لئے فنِ تقریر میں کمال پیدا کرنا

فنِ تقریر

(دیباچۂ عمومی فنِ تقریر مطبوعہ سنہ ۱۹۴۰ء)

اِنسان حیوانِ ناطق ہے۔ اِس بولنے والے جاندار کو دُنیا کی دوسری مخلوقات پر اِسی وجہ سے اِمتیاز حاصل ہے کہ وہ بول سکتا ہے۔ اس کے اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا اہم سبب اُس کا نطق سے سرفراز ہونا ہی قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو انسان بہت اچھا بول سکتا ہے وہ دوسرے اِنسانوں پر یقیناً فضیلت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجی گفتگو ہو یا مجمع کی تقریر دونوں موقعوں پر وہی شخص بازی لیجاتا ہے جس کو اپنی قوتِ گویائی پر قابو ہوتا ہے اور جو اپنے خیالات کو ایک خاص سلیقے اور خوبی کے ساتھ دوسروں پر ظاہر کر سکتا ہو۔

دُنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جن قوموں نے عروج حاصل کیا اور سماجی نقطۂ نظر سے کامیاب اور شائستہ زندگی بسر کی اُنہی میں اعلیٰ درجے کے مقرر پیدا ہوئے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوتِ تقریر میں کمال پیدا ہونا انتہائی تہذیب و شائستگی کی دلیل ہے۔ عربوں، یونانیوں، رُومیوں، فرانسیسوں اور انگریزوں میں جتنے بڑے بڑے مقرر پیدا ہوئے دنیا کی دوسری قوموں میں اُنکی نظیر نہیں ملتی۔ اور یہی وہ قومیں ہیں جنھوں نے اِنسان کی تاریخ اور تمدن کے بنانے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔

غرض اِنفرادی کامیابی ہو کہ اجتماعی دونوں کے لئے فنِ تقریر میں کمال پیدا کرنا

فنِ تقریر

(دیباچۂ عمومی فنِ تقریر مطبوعہ سنہ ۱۹۴۰ء)

اِنسان حیوانِ ناطق ہے۔ اِس بولنے والے جاندار کو دُنیا کی دوسری مخلوقات پر اسی وجہ سے اِمتیاز حاصل ہے کہ وہ بول سکتا ہے۔ اس کے اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا اہم سبب اُس کا نطق سے سرفراز ہونا ہی قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو انسان بہت اچھا بول سکتا ہے وہ دوسرے اِنسانوں پر یقیناً فضیلت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجی گفتگو ہو یا مجمع کی تقریر دونوں موقعوں پر وہی شخص بازی لیجاتا ہے جس کو اپنی قوتِ گویائی پر قابو ہوتا ہے اور جو اپنے خیالات کو ایک خاص سلیقے اور خوبی کے ساتھ دوسروں پر ظاہر کر سکتا ہو۔

دُنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جن قوموں نے عروج حاصل کیا اور سماجی نقطۂ نظر سے کامیاب اور شائستہ زندگی بسر کی اُنہی میں اعلیٰ درجے کے مقرر پیدا ہوئے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوتِ تقریر میں کمال پیدا ہونا اِنتہائی تہذیب و شائستگی کی دلیل ہے۔ عربوں، یونانیوں، رومیوں، فرانسیسوں اور انگریزوں میں جتنے بڑے بڑے مقرر پیدا ہوئے دنیا کی دوسری قوموں میں اُنکی نظیر نہیں ملتی۔ اور یہی وہ قومیں ہیں جنھوں نے اِنسان کی تاریخ اور تمدن کے بنانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

غرض اِنفرادی کامیابی ہو کہ اجتماعی دونوں کے لئے فنِ تقریر میں کمال پیدا کرنا

اور بابو کیشب چندر سین کے نام ہمیشہ احترام سے لئے جائیں گے۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں اعلیٰ پایہ کی تقریروں کا آغاز سرسید ہی کی قومی، مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہوا۔ یہ سرسید ہی کا لگایا ہوا پودا تھا جو نواب محسن الملک، شمس العلما مولوی نذیر احمد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولوی عزیز مرزا، مولوی ظفر علی خاں، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی آبیاریوں کی وجہ سے اب ایک ایسا تناور اور سرسبز و شاداب درخت بن گیا ہے کہ نواب بہادر یار جنگ بہادر جیسا گل سرسبد اردو کو حاصل ہوا۔

یہ اہل حیدرآباد کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے ملک سے ایک ایسا اعلیٰ پایہ مقرر پیدا ہوا جس کی ٹکر کا کوئی مقرر آج تمام اردو دنیا میں نہیں۔ اب یہ اس سرزمین کے رہنے والوں اور اردو زبان بولنے والوں کا کام ہے کہ اس سعادت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے اس فصیح البیان مقرر کی خصوصیات اور کمالات کو پیش نظر رکھ کر خود بھی فنِ تقریر میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کتاب ایسے ہی باہمت افراد کی مدد اور سہولت کے لئے مرتب کی گئی ہے۔

اگر کچھ عرصہ سے اردو میں تصنیف و تالیف کا ذوق عام ہوتا جا رہا ہے اور ہر روز کوئی نہ کوئی نئی کتاب یا رسالہ ہماری نظر سے گذرتا ہے لیکن ایک ترقی پذیر قوم کے ہر فرد کو یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے کہ تحریر میں تقریر کی بات نہیں آتی۔ تحریر سے تقریر کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دماغ پر تحریر کا اثر زیادہ ہوتا ہے لیکن اگر جذبات اور احساسات کو بیدار کرنا ہو تو تقریر ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو عمل کی طرف اتنا جلد راغب نہیں کیا جا سکتا

جتنا کہ تقریر سے کر سکتے ہیں۔ ہر اہم معاملہ میں صرف تقریر ہی کے ذریعہ سے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ تقریر ہی سے مُردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ سوئے ہوئے جاگ پڑتے ہیں۔ اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوئے لوگ سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ تقریر ایک بولتا ہوا جادو ہے جو مقرر کی زبان سے نکلتے ہی سامعین کے دل و دماغ کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو وہ کام کر جاتی ہے جو دنیا کی بڑی بڑی دولت بھی سر انجام نہیں کر سکتی۔

ہندستان کی بدلتی ہوئی سیاست اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کی نئی پود اس دولت سے مالا مال ہو۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہی جماعت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکے گی جس کے زیادہ سے زیادہ افراد اس کمال سے بہرہ ور ہوں۔ اور جس میں اعلیٰ پایہ کے مقرر موجود ہوں۔

اگرچہ ترقی یافتہ زبانوں میں فن تقریر و خطابت سے متعلق کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور آئے دن لکھی جا رہی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اُردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہیں۔ اور یہ بھی مولوی سجاد مرزا صاحب کی بالغ نظری اور موقع شناسی کا نتیجہ ہے کہ زیر نظر کتاب ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے شائع کی جا رہی ہے۔ صاحب موصوف ہی نے تقریباً ایک سال قبل فن تقریر سے متعلق ایک ایسی کتاب ادارہ کو اشاعت کی غرض سے عنایت کی جو آج سے ٹھیک پچاس سال قبل یعنے ۲۳ راپریل سنہ ۱۸۹۸ء کو شمشیر پریس ناہن سے طبع ہوئی تھی اور جس کے ابتدائی اور آخری اوراق غائب ہیں۔ یہ غالباً کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جو ڈیمی سائز کے ۷۶ صفحات پر چھپا ہے اور حسام الدین صاحب ساکن موس بلڈنگ گرانٹ روڈ بمبئی کا نتیجۂ قلم

اور بابو کیشب چندر سین کے نام ہمیشہ احترام سے لئے جائیں گے۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں اعلیٰ پایہ کی تقریروں کا آغاز سرسید ہی کی قومی، مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہوا۔ یہ سرسید ہی کا لگایا ہوا پودا تھا جو نواب محسن الملک، شمس العلما مولوی نذیر احمد، مولٰنا عبدالباری فرنگی محلی، مولوی عزیز مرزا، مولوی ظفر علی خاں، مولٰنا محمد علی اور مولٰنا ابوالکلام آزاد کی آبیاریوں کی وجہ سے اب ایک ایسا تناور اور سرسبز و شاداب درخت بن گیا ہے کہ نواب بہادر یار جنگ بہادر جیسا گل سرسبد اردو کو حاصل ہوا۔

یہ اہل حیدرآباد کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے ملک سے ایک ایسا اعلیٰ پایہ مقرر پیدا ہوا جس کی ٹکر کا کوئی مقرر آج تمام اردو دنیا میں نہیں۔ اب یہ اس سرزمین کے رہنے والوں اور اردو زبان بولنے والوں کا کام ہے کہ اس سعادت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے اس فصیح البیان مقرر کی خصوصیات اور کمالات کو پیش نظر رکھ کر خود بھی فنِ تقریر میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کتاب ایسے ہی باہمت افراد کی مدد اور سہولت کے لئے مرتب کی گئی ہے۔

اگر کچھ عرصہ سے اردو میں تصنیف و تالیف کا ذوق عام ہوتا جا رہا ہے اور ہر روز کوئی نہ کوئی نئی کتاب یا رسالہ ہماری نظر سے گذرتا ہے لیکن ایک ترقی پذیر قوم کے ہر فرد کو یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے کہ تحریر میں تقریر کی بات نہیں آتی۔ تحریر سے تقریر کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دماغ پر تحریر کا اثر زیادہ ہوتا ہے لیکن اگر جذبات اور احساسات کو بیدار کرنا ہو تو تقریر ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو عمل کی طرف اتنا جلد راغب نہیں کیا جا سکتا

معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب اِمتداد زمانہ کی وجہ سے اَب تقریباً نایاب ہو چکی ہے اور پچاس سال قبل کا اُردو ترجمہ ہونے کی وجہ سے اس کی زبان اکثر جگہ ناقابلِ فہم ہے اس لئے اس پر مکمل نظرِثانی کی گئی اور جگہ جگہ کئی عبارتوں کا اِضافہ بھی کیا گیا۔ آخری باب اور تصویریں عہدِ حاضر کی انگریزی اور امریکن مطبوعات سے مدد لے کر تیار کی گئی ہیں اُن کی تیاری و ترتیب میں بھی مولوی سجاد مرزا صاحب نے ذاتی دلچسپی لی اور ادارہ کی خاطر خواہ مدد فرمائی۔ بہرحال یہ کتاب صحیح معنوں میں صاحبِ موصوف ہی کے نام معنون کی جاسکتی ہے۔

یقین ہے کہ مدرسوں کے طلبہ اور تعلیم یافتہ نوجوان اِس کے مطالعہ سے فائدہ اُٹھائیں گے اور اس کی ہدایتوں کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے اپنے مدرسوں اور انجمنوں میں اِس کے مشوروں کے مطابق عمل کرکے اچھی تقریر کرنے میں کامیابی حاصل کریں گے۔

متاعِ اقبال

(تبصرۂ متاعِ اقبال مطبوعہ سب رس بابتہ دسمبر ۱۹۴۲ء)

یہ کتاب چھوٹی نصابی کتابوں کی تقطیع کے ٹھیک سو صفحات پر چھپی ہے۔ اس کے مرتب مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم، اے لکچرار سٹی کالج ہیں۔ اقبال کے متعلق گذشتہ چند برسوں میں کئی کتابیں اور مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور ان کے انتقال کے بعد سے تو یہ موضوع اہلِ اردو کے لئے خاص دلچسپی کا باعث بن گیا ہے اکثر اردو رسالوں نے اقبال کی یاد میں اپنے مخصوص نمبر شایع کئے اور شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ سائنس اور دوسرے علوم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب نے بھی اقبال کے کلام کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی خوبیوں کے اعتراف میں طویل مقالے تحریر کئے۔ "متاعِ اقبال" میں تین اہم عنوانوں پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پہلے عنوان کے تحت اقبال کی شاعری کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ہندوستان کی تاریخ اور تمدنی حالات کا سرسری خاکہ کھینچ کر ہر زمانہ کے اردو ادب کے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں رائے ظاہر کی ہے اور اقبال کی شاعری کے آغاز کے وقت ہندستان کا جو رنگ تھا اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دوسرا عنوان "اقبال کا ذہنی ارتقا" ہے اسی عنوان کے تحت مصنف نے زیادہ لکھا ہے۔ خاص کر غالب اور اقبال کا موازنہ شرح و بسط سے کیا ہے۔ اور پھر اقبال کی نظموں کے مجموعوں پر تاریخی ترتیب کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

متاعِ اقبال

(تبصرۂ متاعِ اقبال مطبوعہ سب رس بابتہ دسمبر ۱۹۴۶ء)

یہ کتاب چھوٹی نصابی کتابوں کی تقطیع کے ٹھیک سو صفحات پر چھپی ہے۔
اس کے مرتب مولوی ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم ۔ اے نظام کالج ہیں۔ اقبال کے متعلق گذشتہ چند برسوں میں کئی کتابیں اور مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور ان کے انتقال کے بعد سے تو یہ موضوع اہلِ اُردو کے لئے خاص دلچسپی کا باعث بن گیا ہے اکثر اُردو رسالوں نے اقبال کی یاد میں اپنے مخصوص نمبر شایع کئے اور شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ سائنس اور دوسرے علوم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب نے بھی اقبال کے کلام کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی خوبیوں کے اعتراف میں طویل مقالے تحریر کئے۔ "متاعِ اقبال" میں تین اہم عنوانوں پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پہلے عنوان کے تحت اقبال کی شاعری کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ہندوستان کی تاریخ اور تمدنی حالات کا سرسری خاکہ کھینچ کر ہر زمانہ کے اُردو ادب کے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں رائے ظاہر کی ہے اور اقبال کی شاعری کے آغاز کے وقت ہندوستان کا جو رنگ تھا اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دوسرا عنوان "اقبال کا ذہنی ارتقاء" ہے اسی عنوان کے تحت مصنف نے زیادہ لکھا ہے۔ خاص کر غالب اور اقبال کا موازنہ شرح و بسط سے کیا ہے۔ اور پھر اقبال کی نظموں کے مجموعوں پر تاریخی ترتیب کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

کلیاتِ بجری

(تبصرۂ کلیات بجری مطبوعہ سب رس بابتہ دسمبر ۱۹۴۲ء)

آج کل اُردو زبان میں نئی کتابوں کے ساتھ ساتھ پُرانی کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں اور یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن واقعہ ہے کہ پرانی کتابوں کو صحت کے ساتھ چھاپنا نئی کتابوں کے چھاپنے سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ پرانی کتابوں کی زبان بھی پرانی ہوتی ہے۔ اور ان کی کتابت و طباعت کے وقت کاتب اور مطبع کے لوگ پرانے لفظوں کو غلط سمجھ کر ان کی جگہ نئے لفظ رکھ دیتے ہیں اور اس طرح کتابوں کے مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں میں بہت کم ایسی ہوں گی جن کی قدیم کتابیں ابھی تک چھپ کر منظرِ عام پر نہ آچکی ہوں۔ اُردو کو اسی لئے پوری طرح ایک ترقی یافتہ زبان نہیں کہا جاتا کہ اس میں ابھی بہت سے کام باقی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بعض بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے ابھی مخطوطوں ہی کی شکل میں ہیں۔ جب تک ہر دور اور ہر مقام کی جملہ اہم اُردو کتابیں شائع نہ ہو جائیں گی اس وقت تک اُردو ادب کی ایک مکمل تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی۔ اور اسی وجہ سے کوئی مکمل تاریخ اَب تک لکھی بھی نہیں گئی۔

قاضی محمود بجری اُردو کے ایک بہت بڑے شاعر اور صوفی ہیں ان کی ایک کتاب من لگن بہت عرصہ پہلے چھپ چکی ہے۔ اور اَب ان کا کلیات بڑی تقطیع کے

تین سو سے زیادہ صفحات پر نولکشی پریس لکھنو سے شائع ہوا ہے۔ اس کلیات کو ڈاکٹر محمد حفیظ سید ایم۔ اے، پی، ایچ ڈی، ڈی لٹ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی نے ایک مفید مقدمہ اور تشریح کے ساتھ شایع کیا ہے۔

مقدمہ میں پانچ باب ہیں۔ جن میں بحری کے عہد کی تاریخ، ان کے ہم عصر شعرا، سوانح حیات، تصانیف اور کلام بحری کی لسانی خصوصیت پر اچھی بحث کی ہے۔ بحری بیجاپور اور گولکنڈہ کے آخری بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ انھوں نے اِن سلطنتوں کے زوال کے بعد بھی عرصہ تک اُردو شعر و شاعری کی شمع کو روشن رکھا۔ ان کی زبان ولی اورنگ آبادی کی طرح ایک عبوری دَور کی زبان سمجھی جاسکتی ہے نہ قدیم شعرا مثلاً وجہی وغواصی و نصرتی کی طرح ہندی آمیز ہے اور نہ دورِ متوسط کے شعرا آبرو و ناجی اور حاتم و مظہر کی طرح فارسی آمیز۔ کلیاتِ بحری کے مطالعہ سے تصوف و عرفان کی چاشنی بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ کیونکہ بحری خود ایک بہت بڑے صوفی اور اہل اللہ تھے۔ ڈاکٹر سید کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے اور یقین ہے کہ کلیاتِ ولی کی طرح کلیاتِ بحری کو بھی اہلِ ذوق نعمتِ غیر مترقبہ سمجھیں گے۔

نمایاں کرنے کے باوجود اُن کو اپنے قلم پر ایسا قابو حاصل تھا کہ وہ انگارہ یا شرارہ نہیں بن جاتا۔

شریف عورتیں اُن کی کتابوں کا شوق اور عقیدت سے مطالعہ کرتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہزاروں زندگیاں محض راشد الخیری کے ادب کے مطالعہ سے بن گئیں اُن کی زندگی ہی میں اُن کی کتابوں کو ایسی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی کہ اردو کی تاریخ میں اس کی نظیر کم ملے گی۔ اور یہ بھی اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ وہ اپنے بعد بھی اپنے کام کو چلانے والے چھوڑ گئے جو پوری توجہ اور خلوص کے ساتھ اُن کے ادب کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ اُن کے فرزند رازق الخیری اور صادق الخیری دونوں قابل مبارک باد ہیں۔ کہ انہوں نے نہ صرف اپنے والد کی سلگائی ہوئی شمع کو بجھنے سے باز رکھا بلکہ اُس کی روشنی کو دور دور تک پھیلانے کی کوشش میں سرگرم ہیں۔

مصروفِ خواب نہیں دیکھا اور آج تک اس کا یہی پروگرام ہے۔"

اس کتاب میں شاعر کی ایک اچھی تصویر بھی ہے جس کو دیکھ کر اس مزدور شاعر کا وہ قول یاد آجاتا ہے جو اس کے دوست نے اپنے اشارات میں نقل کیا ہے کہ

"یاد رکھو میری بوریئے پر آنکھیں کھلی ہیں اور قالین پر دم نکلے گا۔"

نوائے کارگر میں سو سے زیادہ نظمیں اور تقریباً بیس غزلیں ہیں۔ نظموں کو مختلف عنوانوں مثلاً حسنِ خیال، مناظر، قلب و نظر، زبورِ محبت، ہجومِ خیال اور لہریں وغیرہ کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے عنوان میں حمد و نعت ہے۔ نعت میں ایک بڑی پاکیزہ نظم ہے جس کے چند آخری شعر یہ ہیں۔

غلاموں کو دیا اس شان سے پیغامِ آزادی
کہ گردش میں ہے تیرہ سو برس سے جامِ آزادی
کتاب اس پر وہ اتری ہے جسے قرآن کہتے ہیں
تمدن کی تدبر کی وفا کی جان کہتے ہیں
وہ قرآں جس کی ضو سے بزمِ باطن میں اُجالا ہے
وفا میں سربلندی حریت کا بول بالا ہے
جہاں جب تک جہاں میں عظمتِ قرآن باقی ہے
مکمل یادگارِ سیدِ ذی شان باقی ہے
جو ہے قرآں کا منکر اس کا ایماں ہو نہیں سکتا
غلامی کا جو حامی ہے مسلماں ہو نہیں سکتا

"احسان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ چراغاں ۲۲۰ صفحات میں چھپا ہے۔

ثابت ہوا کہ فطرتِ زریں سرور ہے　　　شہرت کا طمطراق حقیقت سے دور ہے

احسان دانش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ آتش خاموش ہے۔ اس میں ڈیڑھ سو صفحات کی نظمیں اور پچاس صفحات پر غزلیں ہیں۔ ان تین مجموعوں کے علاوہ دو اور دو مجموعے نفیرِ فطرت، جادۂ نو، کی اشاعت کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ یہ سب کتابیں اردو شاعری میں ایک صحت مند اور مفید اضافہ ثابت ہوں گی۔ اور ان نوجوانوں کے لئے خضرِ منزل کا کام دیں گی جو شاعرانہ ترنگوں، شبابیاتی کیفیتوں اور آزادی و رعنائی خیال کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ مذہب، شائستگی اور تہذیب کو گالیاں دئے بغیر گزیر نہیں۔ احسان کے کلام میں حریت و آزادی اور خلوص و صداقت اور پاکیزہ جذبۂ عمل نے جس خوبی سے امتزاج پایا ہے اس کی نظیر جدید اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی۔ اور یہ تمام خوبیاں نتیجہ ہیں علم و کمال اور محنت و عمل کے دوش بدوش چلنے کا جہاں ان میں سے ایک نے دوسرے کا دامن چھوڑا اور وہ بے ڈھنگا پن اور بے راہ روی پیدا ہو گئی جو عہدِ حاضر کے بعض برخود غلط نوجوان شاعروں اور ادیبوں کا طرۂ کمال ہے۔

دُنیا کی کہانی

(تبصرۂ دُنیا کی کہانی مطبوعہ سب رس بابتہ ستمبر ۱۹۳۹ء)

چھوٹی تقطیع پر چھپی ہے۔ اِس میں ۲۲۷ صفحات اور کئی تصویریں ہیں۔ اِس کے مصنف جامعۂ ملیہ دہلی کے ایک اُستاد مولوی محمد مجیب صاحب ہیں۔ اور یہ کتاب اُن تقریروں کا مجموعہ ہے جو آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر تیار کی گئی تھیں اور اسی کی اجازت سے ایک کتابی شکل میں چھاپی گئی ہیں جیسا کہ مصنف کا خیال ہے یہ نہ تو دنیا کی ایک مکمل تاریخ ہے اور نہ کوئی دلچسپ کہانی۔ تاہم ایک ایسی مفید اور دلچسپ کتاب ضرور ہے جس کے مطالعہ سے معلومات میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے اور جو لوگ اِس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو اس کے پڑھنے کے بعد تاریخ عالم کا ایسا ذوق پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ دوسری بڑی بڑی کتابیں بھی پڑھنا چاہتے ہیں۔

اُردو زبان میں اِس قسم کی کتابوں کی کمی ہے۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ بعض اچھی اچھی کتابیں محض لاسلکی کی وجہ سے لکھی جا رہی ہیں اور اِس طرح عام اُردو دانوں کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔

دنیا کی کہانی اصل میں ۷ مختلف کہانیوں پر مشتمل ہے جن کو ترتیب کے ساتھ یکجا کر دینے کی وجہ سے ایک تاریخ کی شکل بن گئی ہے۔ اور یہ اسی طرح لکھی اور ریڈیو پر سنائی بھی گئی ہے کہ سننے والے ابتدا سے آج تک کی تاریخی معلومات کو ۷ تقریروں میں بآسانی سن سکیں۔

کرتے ہوں گے اور یہ کہ حیدرآباد کے امراء عظام کے خاندانوں میں اب بھی ایسے افراد موجود ہیں جو اپنے اسلاف کے ذوق علم وفضل سے بے بہرہ نہیں ہیں۔

یہ سیاحت نامہ نواب محمد ظہیر الدین خاں کے فطری ذوق ادب کا بہترین ثبوت ہے اور یقین دلاتا ہے کہ اگر ان کا یہی علمی شغف اور دلچسپی جاری رہی تو ان کی ذات اردو کے لئے باعث فخر ہوسکتی ہے۔ ملک کی بہت سی توقعات ان سے وابستہ ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ اپنے نامور اسلاف کے سچے جانشین ثابت ہوں۔

سیاحت نامہ ۱۷ ابواب پر منقسم ہے جن میں ۸، مئی ۱۹۳۳ء سے ۸، اکتوبر ۱۹۳۳ء تک (یعنی کل پانچ ماہ) کے حالات سفر درج ہیں۔ ۸ مئی کو مولف نے حیدرآباد سے کوچ کیا اور ۸، اکتوبر کو یہیں واپس ہوگئے۔ اس مختصر سی مدت میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اس کو اس خوبی سے قلمبند کیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سفرنامہ شروع سے آخر تک دلچسپ ہے اور پر از معلومات۔

مولف نے اپنے موروثی عقیدہ کی بناپر اس دیدہ زیب کتاب کو ہز ہائی نس پرنس آف برار کے نام نامی پر حسب ذیل الفاظ میں معنون کیا ہے۔

> میں اپنے حقیقی جذبۂ وفاداری اور پر خلوص عقیدت مندی کی بنا پر اپنے اس ناچیز سفرنامۂ یورپ و امریکہ کو میجر جنرل شہزادہ والاشان حضرت نواب اعظم جاہ بہادر ولی عہد وسپہ سالار دولت آصفیہ کے نام نامی سے معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔"

اس سیاحت نامہ کی اہمیت اور اس سے متعلقہ دیگر امور کی وضاحت اس کے دیباچہ کے حسب ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوگی۔

داغ

(تبصرہ مطبوعہ مجلّہ عثمانیہ بابت مارچ ۱۹۳۷ء)

مولوی نوراللہ محمد صاحب نوری جامعہ عثمانیہ کے اُن فیض یافتوں میں سے ہیں جن کو شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق ہے اور جو اپنی بساط کے مطابق اپنی زبان اور ملک کی خدمت گزاری میں خلوص اور ایثار کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ شعر و سخن سے متعلق اُن کے متعدد مضامین مجلہ عثمانیہ اور آئینۂ ادب میں شایع ہو چکے ہیں۔ خود بھی ایک رسالہ "مشاعرہ" شایع کیا کرتے تھے جو ناموافق ماحول میں چل نہ سکا۔ نیز اُنھوں نے اِنتخابِ کلامِ غالب معہ شرح کے شایع کیا ہے جو ادب کے طلبہ کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ نظم طبا طبائی مرحوم اور حضرت جلیل اُستاد السلطان پر ان کے جو مضامین مجلہ عثمانیہ میں شایع ہوئے ہیں نہایت دلچسپ اور اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ اِسی سلسلہ میں اُنھوں نے داغ پر بھی لکھنا شروع کیا تھا۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ "اِدارۂ اُدبیاتِ اُردو" کی طرف سے اُن بلند پایہ اساتذۂ سخن کا ایک تذکرہ شایع کیا جائے جنھوں نے دہلی اور لکھنو سے ہجرت کر کے حیدرآباد کو اپنا وطن بنا لیا اور آخر کار یہیں کے ہو رہے۔

اثنائے کار میں حضرت جہاں استاد کے متعلق نوری صاحب کو اتنا مواد

ہاتھ آگیا کہ بجائے مضمون کے ایک کتاب تیار ہوگئی جو دلچسپی اور معلومات دونوں نقطۂ نظر سے قابلِ قدر ہے۔ حضرت داغ دہلوی کی ہستی اتنی رفیع الشان ہے کہ اُن پر ابھی اور لکھنے کی گنجایش ہے اور کیا تعجب ہے کہ خود نوری صاحب اِس موضوع پہ کام جاری رکھیں اور کسی وقت اسی زیرِ نظر کتاب کا دوسرا مکمل ایڈیشن شایع کریں جو فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ کی مکمل سوانح حیات کا کام دے سکے۔

بحالت موجودہ بھی اُدب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب بے حد غنیمت ہے اور اہلِ اُردو کو نوری صاحب کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے ایک ایسے موضوع کی طرف توجہ کی جو ابھی بہت تشنہ ہے اور ضرورت تھی کہ اُس پر قلم اُٹھایا جاتا۔

اِس کتاب کو دس فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں داغ کے حالاتِ زندگی اُن کا ماحول، ان کی شاعری کے محرکات، ان کا مقصد اور فلسفہ زندگی، مقامی عناصر، اسلوب بیان، اور تلامذہ وغیرہ پر وضاحت سے بحثیں کی ہیں۔ ان سب میں دو عنوانات کے تحت (یعنی داغ کی شاعری کا مقصد اور فلسفہ زندگی اور داغ کا ہندوستانی زبان میں تعمیری حصہ) ضروری اور نئی معلومات خوبی سے پیش کی گئی ہیں۔

حالاتِ زندگی کا حصہ ابھی تشنہ ہے ان کے والد اصل میں رئیس فیروزپور جھرکہ تھے۔ لوہارو کے رئیس اُن کے چچا نواب امین الدین احمد خاں تھے۔ نواب شمس الدین احمد خاں لوہارو کے رئیس کبھی نہ رہے۔ اِس سلسلہ میں اس امر کی ضرورت تھی کہ داغ کے آبا و اجداد کا ذکر وضاحت سے کیا جاتا اور مرزا غالب سے اُن کو

جو قریبی رشتہ تھا وہ بھی دکھلایا جاتا کیونکہ عام طور پر داغ کے خاندان کے متعلق غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔

مولوی نوری صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں بعض ایسے اُمور کا تذکرہ کیا ہے جو اِس موضوع اور کتاب کے شایان شان نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے متن کتاب میں داغ کی جو کچھ خوبیاں بیان کی ہیں اور ان کی شخصیت کو جس قدر عظیم الشان ثابت کیا ہے دیباچہ میں اُن سب کا تخلیہ کیا ہے گویا ایک ہی کتاب میں دو مختلف موضوعوں پر مباحثہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا موضوع تو یہ ہے کہ ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر اپنی زبان اور ملک و قوم کی کس خوبی سے خدمت کر سکتا ہے لیکن دیباچہ میں یہ لکھا ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کے مقابلہ میں ایک معمولی سپاہی کو بھی اَدب کی خدمت میں افضلیت حاصل ہوتی ہے۔ نوری صاحب فردوسی اور سلطان محمود غزنوی کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں:-

"اُس (محمود غزنوی) کا ایک ادنیٰ سپاہی بھی اَدب کی خدمت کرنے میں فردوسی سے چار قدم آگے تھا۔" اس عجیب و غریب بحث کو جاری رکھتے ہوئے مولف نے لکھا ہے کہ۔

"اگر عہدہ دار اور اس کے ماتحتین عمدگی سے اپنے فرائض کو بجالا رہے ہیں تو وہ اپنے اَدب اور زبان کی بنیادوں کو مستحکم کر رہے ہیں۔" غرض کتاب کا پورا مقدمہ یعنی تقریباً بیس صفحات اسی عجیب و غریب ذہنیت اور انتشار خیال کے نذر کر دیئے گئے ہیں اسکو پڑھنے کے بعد کتاب کے متعلق بری خراب رائے قایم کرنی پڑتی ہے حالانکہ اصل کتاب نہایت سنجیدہ دماغی اور صحیح نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس قابل ہے کہ اُردو شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے اِس کے مطالعہ سے مستفید ہوں۔

فلسفۂ عجم

(تبصرۂ فلسفۂ عجم مطبوعہ مجلۂ عثمانیہ بابت جون سنہ ۱۳۳۶ف)

یہ کتاب اُردو کے مایہ ناز شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی مشہور انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے جس کو جامعہ عثمانیہ کے ایک طیلسانی مولوی میر حسن الدین صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی نے آٹھ سال قبل مکمل کر لیا تھا لیکن اُردو زبان کی طباعتی دقتوں کے باعث اب تک مسودہ کی حالت میں پڑا رہا اور اب مولوی تصدق حسین صاحب تاج (مالک احمدیہ پریس) کی کوششوں سے شائع ہوا ہے۔

میر حسن الدین صاحب اُن قابل فخر فرزندان جامعہ عثمانیہ میں سے ہیں جنھوں نے اپنی سنجیدہ اور اعلیٰ علمی خدمات کی وجہ سے اپنی مادر جامعہ کی علمی شہرت قائم کر دی اور جو بغیر کسی سرپرستی یا قدر دانی کے محض علم کی خدمت اور ذاتی شغف کی بنا پر مسلسل سرگرم عمل ہیں اُن کی دوسری کتابیں (۱) مبادی فلسفہ اور (۲) فلسفہ برگساں عرصہ ہوا شایع ہو چکیں۔ اول الذکر میں فلسفہ کے مسائل و نظریات اور فلسفۂ جدید کے مختلف مکاتب کو سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ موخر الذکر کتاب مشہور فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں کے فلسفیانہ نظریات کی تشریح و توضیح کرتی ہے اور اس میں خاص کر اس کے نظریۂ ارتقائے تخلیق پر بحث کی گئی ہے۔ اُن کی دو کتابیں (۱) مذہب و عقلیات عصر جدید میں اور (۲) مقالات فلسفہ اس وقت زیر طبع ہیں

ڈاکٹر اقبال کی اصل کتاب فلسفۂ عجم آج سے چھبیس ستائیس سال قبل لکھی گئی تھی علم وفضل کی فضا میں عہدِ حاضر میں آئے دن جو جدید ترین تحقیقات اور تصنیفات شایع ہوتی رہتی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کتاب تقویم پارینہ سمجھی جاسکتی تھی لیکن اِس عالمِ تغیر میں بھی بعض کتابیں تاریخی اہمیت حاصل کر لیتی ہیں اور یہی حال اِقبال کی "فلسفۂ عجم" کا ہے۔ اگرچہ خود ان کے خیالات میں بہت اِنقلاب پیدا ہو چکا ہے اور اگر وہ اس کتاب پر نظرِ ثانی کرنے بیٹھیں تو ممکن ہے کافی تغیر و تبدل رُونما ہو جائے تاہم اس کتاب کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو متعلمین فلسفہ کے علاوہ اَدبیات کے اہلِ ذوق کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

اِس کتاب میں اقبال نے ایرانی قوم کی مخصوص روح اور اُس کی خاص سیرت کو بے نقاب کرنے کے علاوہ تصوف کے متعلق نہایت حکمیاتی (سائنٹیفک) بحث کی ہے۔ یہ ایسے موضوع ہیں جن پر اُردو زبان میں کوئی قابلِ ذکر تصنیف موجود نہیں ہے۔ اس لحاظ سے میر حسن الدین صاحب کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے اور اس کا مطالعہ نہ صرف فلسفہ کے اہلِ ذوق بلکہ اَدبیاتِ اُردو اور خاص کر شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کیونکہ سارا اُردو اَدب فارسی تخیلات و معتقدات اور تصوف کی جھلکوں سے معمور ہے اور جو اربابِ اُردو اپنے اَدب کو صحیح نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔

ڈاکٹر اقبال کی اصل کتاب فلسفۂ عجم آج سے چھبیس ستائیس سال قبل لکھی گئی تھی علم وفضل کی فضا میں عہد حاضر میں آئے دن جو جدید ترین تحقیقات اور تصنیفات شائع ہوتی رہتی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کتاب تقویم پارینہ سمجھی جا سکتی تھی لیکن اِس عالمِ تغیر میں بھی بعض کتابیں تاریخی اہمیت حاصل کر لیتی ہیں اور یہی حال اِقبال کی "فلسفۂ عجم" کا ہے۔ اگرچہ خود ان کے خیالات میں بہت اِنقلاب پیدا ہو چکا ہے اور اگر وہ اس کتاب پر نظرِ ثانی کرنے بیٹھیں تو ممکن ہے کافی تغیر و تبدل رُونما ہو جائے تاہم اس کتاب کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو متعلمین فلسفہ کے علاوہ اَدبیات کے اہل ذوق کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

اِس کتاب میں اقبال نے ایرانی قوم کی مخصوص روح اور اُس کی خاص سیرت کو بے نقاب کرنے کے علاوہ تصوف کے متعلق نہایت حکیمیاتی (سائنٹیفک) بحث کی ہے۔ یہ ایسے موضوع ہیں جن پر اُردو زبان میں کوئی قابلِ ذکر تصنیف موجود نہیں ہے۔ اس لحاظ سے میر حسن الدین صاحب کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور اس کا مطالعہ نہ صرف فلسفہ کے اہل ذوق بلکہ اَدبیات اُردو اور خاص کر شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کیونکہ سارا اُردو اَدب فارسی تخیلات و معتقدات اور تصوف کی جھلکوں سے معمور ہے اور جو اَربابِ اُردو اپنے اَدب کو صحیح نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔

مکتوبِ اتِ امجد

(تبصرۂ مکتوبات امجد مطبوعہ مجلۂ عثمانیہ بابت جون سنہ ۱۹۳۶ء)

حیدرآباد کے مشہور شاعر سید احمد حسین صاحب آمجد کے چند خطوط کا مجموعہ ہے جو مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اور ان کے عزیزوں کو لکھے گئے ہیں۔ اور ہاشمی صاحب ہی نے ان کو مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ اگر امجد صاحب کے وہ خطوط بھی درج کر دیے جاتے جو ہاشمی صاحب کے علاوہ دیگر اصحاب کو لکھے گئے ہیں تو اس کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا۔ بحالت موجودہ بھی یہ مجموعہ کم دلچسپ نہیں ہے۔ حضرت آمجد کا اسلوب بیان نہایت شگفتہ ہے۔ ان کی تصنیفات کا مطالعہ نوجوانوں میں زندگی کے علاوہ ایک خاص تڑپ پیدا کر دینے کا باعث ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یہ خطوط ضرورتاً لکھے گئے تھے اور اُن کے مصنف کو خیال بھی نہ ہوگا کہ یہ چھاپے جائیں گے یہی وجہ ہے کہ اُن کے اسلوب میں اُس کیف کی کمی ہے جو نثر امجد کی خصوصیت ہے۔ چونکہ اُردو میں مکتوبات بہت کم ہیں اور ہاشمی صاحب نے ایک بلند پایہ شاعر اور انشا پرداز کے خطوط شایع کئے ہیں اس لئے اُن کی یہ سعی قابل شکریہ ہے۔ اگر اسی طرح دوسرے مصنفین و شعرا کے خطوط بھی،

منظرِ عام پر آجائیں تو اُردو اَدب کا ذخیرہ ایک مفید عنصر سے مالامال ہوجائے۔
کسی شخص کے خطوط کا اُس کی زندگی میں شایع ہوجانا بعض دَفعہ اُس کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے اور کیا تعجب ہے کہ حضرت اَمجد کی شخصیت کے متعلق بھی ان خطوط کی وجہ سے حاسد اور نکتہ چین طبیعتوں کو بعض غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موقع مِل جائے۔

ربطِ ناہید

(تبصرہ مطبوعہ سب رس بابتہ مئی سنہ ۴۱ء)

یہ حسین وجمیل کتاب مجموعہ ہے جہاں بانو بیگم ایم۔اے کے خطوط کا جو موقع بموقع ماہنامہ شہاب میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ اُس وقت بھی اِن خطوں کا طرزِ نگارش بتاتا تھا کہ یہ کس کی تراوشِ قلم ہیں اور اب بھی کہ مصنفہ نے ایک دلفریب فریب دینے کی کوشش کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ "ایک دنیا اِس دلفریب غلطی میں مبتلا تھی اور ہے کہ ناہید میرا قلمی نام ہے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اِس پردہ میں کون ہے اور لطف یہ ہے کہ ج نتوی ایک حد تک پردہ باقی رکھنا چاہتی ہیں لیکن اُن کی تمہید اور خطوط کی عبارتوں میں یہ پردہ جگہ جگہ اُٹھنے یا گرنے لگتا ہے۔

ربطِ ناہید عہدِ حاضر کی نسوانی تحریروں کا ایک نفیس نمونہ ہے۔ اب تک عورتوں کی طرف سے مردوں نے فرضی خطوط لکھے اور لیلیٰ کے خطوط جیسے مجموعے شایع کئے تھے۔ لیکن اِس کتاب کے مطالعہ کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ اب مردوں کو صنفِ نازک کی ترجمانی کی ضرورت نہیں یا یوں کہیے کہ عورتیں اب مرد ترجمانوں سے بے نیاز ہو چکی ہیں۔ نسوانی سینہ میں جذبات کا جو اتار چڑھاؤ رہتا ہے، اُس کی آئینہ داری مرد سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ جس پر اپنی جنس کی کثافت کا رنگ چڑھا رہتا ہے۔

اس کے لئے تو کسی نسوانی قلم ہی کی ضرورت ہے۔ اور بربطِ ناہید کی مصنفہ نے اپنے خطوط کی رعنائی اور رنگینی کے ذریعہ سے ثابت کر دیا کہ واقعی صنفِ نازک کے دِل کی گہرائیوں تک پہنچنا اور عہدِ حاضر کے تعلیم یافتہ بتانِ طنّاز کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ اِس مجموعۂ رنگا رنگ کے مطالعہ کے بعد نہ معلوم ان زاہدانِ خشک اور "پروفیسرانِ برخود غلط" کے چہروں کا کیا رنگ ہو جو عورتوں کی تعلیمی ترقی اور انشا پردازانہ کمال کا اب بھی اعتراف نہیں کرنا چاہتے۔

کچھ نمونہ اور خصوصیاتِ سخن پر تبصرہ اِدارۂ اَدبیاتِ اُردو کے مشہور تذکرہ مُرقعِ سخن جلد دوم میں شایع ہو چکا ہے اور معلوم ہوا ہے کہ اُن کے کلام کا مجموعہ بھی آج کل زیرِ طبع ہے اور قریب میں شایع ہو کر منظرِ عام پر آجائے گا۔ اگرچہ اُن کی نثر میں بھی ایک طرح کی اَدبی حلاوت موجود ہے لیکن اِظہارِ خیال کے لئے اُنھوں نے ٹیگور کی تقلید میں جو پیرایۂ بیان اِختیار کیا ہے وہ نوجوانوں میں لاکھ مقبول سہی لیکن اُردو اَدب کے موجودہ رجحانات میں کسی مفید صنف کا اِضافہ نہیں کرتا اور لمعہ جیسے صاحب غور و فکر اَدیبوں کو دیکھ کر نوسیکھ انشا پردازوں کے اس راہ میں بھٹک جانے کا اندیشہ ہے اگر ان مضامین کی جگہ ڈاکٹر لمعہ اَفسانوں کے ذریعہ سے اپنے تاثرات کو پیش کرتے تو یقین ہے کہ اُردو اَفسانہ نگاری میں کچھ نہ کچھ اِضافہ ضرور ہوتا۔

بہرحال یہ کتاب پریم رس اِس قسم کے دوسرے تخیلی مجموعوں کے مقابلہ میں بہت بہتر ہے اور اَدبِ لطیف کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک بڑی نعمت ثابت ہوگی۔

کے تعلیم یافتہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگیاں بسر ہو رہی ہیں جن نوشبابوں نے اِس کوچے میں کبھی قدم رکھا ہے وہ جب اِن افسانوں کو پڑھیں گے تو انھیں ان میں سے اکثر خود ان کی آپ بیتی نظر آئیں گے۔ اور جو لوگ اِس دور سے گزر چکے ہیں وہ اِن افسانوں کے مطالعہ سے معلوم کریں گے کہ مرزا ظفر الحسن صاحب تقلیدی مصنف یا افسانہ نگار نہیں ہیں۔ ان میں جدت اور قوتِ تخیل کی ایسی فراوانی ہے کہ قدیم طرز افسانہ نگاری سے ہٹ کر انھوں نے اپنے لئے ایک نیا میدان نکال لیا جو نہ تو جدید شبابیاتی اور یک گونہ عریاں ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے اور نہ قدیم عشق عاشقی کے افسانوں میں شامل ہو سکتا ہے۔ یہی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب یقیناً مقبول ہوگی۔

اشاریہ

(ا)

آب حیات۔ ۳۱
آب حیات کے بیلنے۔ ۶۱
آب دوز اور سُرنگ۔ ۹۰
آبرو۔ ۱۰۶
ابوظفر عبدالواحد۔ ۱۰۳، ۱۲۹
ابوالفضل سید۔ ۷۳
آتشِ خاموش۔ ۱۱۵
احسان دانش۔ ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۵
احمد علی خاں۔ ۵۰
آر۔ ایچ، پول۔ ۹۷
اردو، رسالہ۔ ۱۱۱
اردو شہ پارے۔ ۳۵، ۷۷
اردوئے قدیم۔ ۷۷
ارسطو جاہ۔ ۶۳، ۶۴، ۶۸
آزاد، ابوالکلام۔ ۹۴
آزاد، گورسرن لعل۔ ۴۳
آزاد، محمد حسین۔ ۲۵، ۳۱، ۴۲، ۶۱
آسماں جاہ، مظہرالدین خاں۔ ۳۷، ۱۰۱
آصف جاہ اول۔ ۸۲
آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ۔ ۷۵، ۷۶، ۷۹، ۸۳
آصفی، حسام الملک خانخانان ۷۹، ۸۳
اعظم جاہ، پرنس آف برار۔ ۷۹، ۸۳، ۱۱۹
آغا داؤد۔ ۸۳
افسر میرٹھی۔ ۲۹
افضل الدولہ، آصفجاہ خامس۔ ۷۸
اقبال۔ ۱۷، ۲۵، ۵۵، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۳
اقتدار الملک۔ رشید الدین خاں ۳۷
اکبر سہیل۔ ۴۱، ۴۲
اکبر وفاقانی ۸۶
التخیام ۴۳

جوش ملیح آبادی۔ ۲۵، ۲۹، ۳۰
جہاں بانو بیگم نقوی۔ ۶۱، ۱۳۱
جیون چرتر۔ ۱۰۱

چ

چراغاں۔ ۱۱۳
چندا، ماہ لقابائی۔ ۱۱۰

ح

حاتم، شاہ حاتم۔ ۱۰۶
حالی۔ ۲۵
حسام الدین۔ ۹۵
حسام الدین غوری۔ ۲۱، ۲۳
حسرت، عبدالقدیر۔ ۸۴
حسن الدین، میر۔ ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۹
حفیظ جالندھری۔ ۲۹
حفیظ سید، ڈاکٹر۔ ۱۰۶
حکایاتِ رومی۔ ۱۷
حیدر حسن، آغا۔ ۳۵

خ

خورشید جاہ، محی الدین خاں ۳۷

د

داغ، مرزا خاں۔ ۳۸، ۱۲۲ تا ۱۲۴
درگاہ۔ ۸۱
دکن میں آردو۔ ۳۲، ۳۳، ۷۷
دنیا کی کہانی۔ ۱۱۶
دنیائے افسانہ ۹۹، ۱۰۰

ر

رازق الخیری۔ ۱۰۹
راشد الخیری۔ ۱۰۷ تا ۱۰۹
رُشدی۔ ۸۶
رشید قریشی۔ ۵۵
رفتار خیال۔ ۶۲
رومی، مولانا جلال الدین ۱۷، ۱۹

س

ساغر نظامی۔ ۲۹
سالار جنگ۔ ۱۹، ۳۵، ۷۱
سالار جنگ اعظم، سر۔ ۶۳، ۶۶، ۶۷، ۶۹، ۱۰۲

سائنس کے کرشمے۔ ۸۸، ۸۹
سب رس، رسالہ۔ ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۱۶، ۱۳۱، ۱۳۵
سجاد مرزا۔ ۱۹، ۹۵، ۹۶
سراج اورنگ آبادی ۸۱
سراج الدین طالب ۸۰
سرسید۔ ۹۳، ۹۴
سرمد۔ ۱۸
سریلے بول۔ ۲۵
سکندر جاہ، آصفجاہ ثالث۔ ۷۸
سلیم، وحید الدین۔ ۳۰
سیاحت نامہ۔ ۱۱۸
سید سلیمان ندوی۔ ۴۸، ۵۱
سید محمد۔ ۴۷، ۸۵

ش

شاد عظیم آبادی ۴۵ تا ۷۴
شاد، مہاراجہ کشن پرشاد۔ ۷۹
شاداں، چندولال ۷۸
شاہ خاموش۔ ۸۳
شاہکار، رسالہ۔ ۴۸
شباب، معین الدین علی خاں۔ ۸۳
شجیع، معظم جاہ۔ ۷۹، ۸۳
شعرائے عثمانیہ۔ ۸۵
شمس الدین احمد خاں۔ ۱۱۳
شمس الامراء، فخر الدین خاں۔ ۳۷، ۷۸
شیدا۔ ۸۱
شمیم۔ ۰۶
شہاب، رسالہ۔ ۱۳۱
شیخ چاند۔ ۱۱۰، ۱۱۱

ص

صادق الخیری۔ ۱۰۹
صحیفۂ آسمانجاہی۔ ۱۰۲
صغریٰ ہمایوں مرزا۔ ۵۰
صغیر۔ ۸۱
صفی، بہبود علی۔ ۸۱

ظ

ظفر الحسن، مرزا۔ ۱۳۵، ۱۳۶

ظفر علی خاں۔ ۹۴
ظہیر الدین خاں۔ ۸۰، ۱۱۸، ۱۱۹

ع

عابد علی۔ ۴۸
عباس حسین عطفی ۹۷، ۹۸
عباس علی لمعہ، ڈاکٹر۔ ۱۳۳، ۱۳۴
عبدالباری فرنگی محلی۔ ۹۴
عبدالحق۔ ۱۲۹
عبدالغفار ابوالمعظم۔ ۵۷
عبدالقادر سروری۔ ۴۳، ۹۹، ۱۲۵
عبدالقیوم خاں باقی۔ ۸۵، ۸۶
عبدالمجید صدیقی۔ ۶۳، ۶۵
عزیز مرزا۔ ۹۴
عزیز یار جنگ عزیز۔ ۸۱
عصر احمد علی۔ ۸۱
عصمت اللہ بیگ، مرزا۔ ۱۷ تا ۲۰
عطاالرحمن۔ ۱۲۹
عظمت زبیدہ بیگم۔ ۲۵
عظمت اللہ خاں۔ ۲۵ تا ۳۰
علی حسین خاں۔ ۵۱
علی منظور، سید۔ ۴۵، ۴۶
عماد الملک ۶۸ تا ۷۰
عمدۃ الملک رفیع الدین خاں۔ ۳۷
عمر خیام نیشاپوری۔ ۴۳، ۴۴

غ

غالب۔ ۳۵، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۹
غواصی۔ ۱۰۶

ف

فردوسی۔ ۱۲۴
فریاد عظیم آبادی۔ ۴۸، ۵۰
فلسفۂ عجم۔ ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۹
فن تقریر۔ ۹۲
فیاض۔ ۸۱
فیض۔ ۷۸، ۸۱
فیض، جعفر حسن خاں۔ ۴۷

فیض محمد۔ ۶۲، ۶۷، ۶۸، ۷۰، ۹۰، ۹۱

ق

قنوطیت۔ ۱۲۹
قیس۔ ۸۱
قیس، معین الدین احمد ۴۷

ک

کلیاتِ بحری۔ ۱۰۵
کیشب چندر سین۔ ۹۴
کیفی، رضی الدین حسن ۸۱

گ

گرو داس۔ ۱۰۱، ۱۰۲
گریہ و تبسم۔ ۵۹
گلشنِ حیات۔ ۴۷

ل

لآلیٔ منثور ۴۱
لطف، لطف الدولہ۔ ۷۹، ۸۳
لطف، مرزا علی۔ ۶۴

م

مائل، ڈاکٹر احمد حسین ۸۱
متاعِ اقبال۔ ۱۰۳
مجلۂ عثمانیہ۔ ۱۱۰، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۹
محبت کی چھاؤں۔ ۱۳۵
محبوب الزمن۔ ۷۷
محبوب علیخاں آصف جاہ سادس۔ ۳۸، ۷۹، ۸۳
محسن الملک۔ ۹۴
محمد اعظم، سید۔ ۷۱، ۱۳۰
محمد تغلق۔ ۳۴
محمد حسین آزاد۔ ۶۱
محمد علی، مولانا۔ ۹۴
محمد قلی قطب شاہ۔ ۲۵
محمد مجیب۔ ۱۱۶، ۱۱۷
محمود غزنوی۔ ۱۲۴

مخدوم محی الدین۔ ۹۶
مرقع سخن (جلد اول) ۷۵
مرقع سخن (جلد دوم) ۸۳، ۱۳۴
مسرور۔ ۸۱
معنوی علی بیوی۔ ۹۷، ۹۸
مظہر جانجاناں۔ ۲۵، ۱۰۶
معین، معین الدولہ۔ ۳۷ تا ۴۰، ۶۹، ۸۳، ۱۰۱، ۱۱۸، ۱۱۹
معین الدین ڈاکٹر۔ ۹۱
معین الدین قریشی ۸۵
معین سخن ۳۷، ۳۸
مکتوبات امجد۔ ۱۲۷
مکتوبات شاد۔ ۴۹
من کی دنیا۔ ۵۵، ۱۳۵
من لگن۔ ۱۰۵
مہدی حسن۔ ۸۵
مہر آفتاب علی خاں۔ ۸۳
میر، میر تقی۔ ۲۵، ۴۸
میر حسن۔ ۷۳، ۷۷
میکش، صاحبزادہ۔ ۵۹، ۸۶

ن

ناجی۔ ۸۱، ۱۰۲
ناصر جنگ شہید۔ ۸۳
ناصر الدولہ آصف جاہ رابع۔ ۷۸
نذر ولی۔ ۷۱
نذیر احمد دہلوی۔ ۹۴
نصرتی۔ ۱۰۶
نصیر الدین ہاشمی۔ ۳۱ تا ۳۵، ۱۲۷
نظام علی خاں آصف جاہ ثانی ۶۳، ۷۸
نظم طباطبائی ۱۲۲
نظیر اکبر آبادی۔ ۲۵، ۲۹
نوائے کارگر۔ ۱۱۲، ۱۱۳
نور اللہ محمد نوری ۱۲۲، ۱۲۴
نیاز فتحپوری۔ ۴۲

و

وجد، سکندر علی۔ ۸۶

وجہی۔ ۱۰۶
وزیر، آصف یار الملک۔ ۸۳
وفائی، جہاں دار علی خاں۔ ۸۳
وقار الامرا فضل الدین خاں ۳۷
ولی اورنگ آبادی۔ ۲۵، ۳۱، ۷۱، ۷۲، ۱۰۶
ولی الدین، میر۔ ۱۲۹

ہ

ہری لال۔ ۱۰۱
ہزہیک بلیو والف۔ ۹۷
ہمایوں مرزا، سید۔ ۵۰
ہندستانی صوتیات۔ ۳۳، ۳۴

ی

یورپ میں دکنی مخطوطات۔ ۳۱، ۳۳، ۷۷
یوسف حسن۔ ۳۳

وجہی۔ ۱۰۶
وزیر، آصف یار الملک۔ ۸۳
وفائی، جہاں دار علی خاں۔ ۸۳
وقار الامرا، فضل الدین خاں ۳۷
ولی اورنگ آبادی۔ ۲۵، ۳۱، ۷۱، ۷۲، ۱۰۶
ولی الدین، میر۔ ۱۲۹

ہ

ہری لال۔ ۱۰۱
ہزمیک بلیو والف۔ ۹۷
ہمایوں مرزا، سید۔ ۵۰
ہندستانی صوتیات۔ ۳۳، ۳۴

ی

یورپ میں دکنی مخطوطات۔ ۳۱، ۳۳، ۷۷
یوسف حسن۔ ۱۳۳